فرزانہ اسماعیل

باران سبز

آج اس کے سارے کام جلدی جلدی ہو گئے تھے۔ ہوسٹل سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچی تو بس بھی فوراً ہی آگئی اور پھر جگہ جگہ رکے بغیر جب اس کے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچی تو اس وقت آٹھ بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے اور جب وہ "احمد کلینک" میں داخل ہوئی اس وقت استقبالیہ پر لگا دیوار گیر کلاک ساڑھے آٹھ کا گھنٹہ بجا رہا تھا۔

وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئی تھی۔

اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مسز باقر نظر نہیں آرہی تھیں شاید ابھی آئی نہیں تھیں۔ انہیں ویسے بھی اکثر چھوٹ مل جایا کرتی تھی۔ شادی شدہ اور بال بچے دور ہونے کی وجہ سے مسز نادر ان کا

مکمل ناول

خیال کر لیتی تھیں مگر اس کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو شادی شدہ تھی اور نہ ہی اس کا کوئی گھر تھا اور جس ہاسٹل میں وہ رہتی تھی، اس کا فاصلہ اس کلینک سے تقریباً" پندرہ کلومیٹر تھا جس کی وجہ سے اسے ذرا سویرے نکلنا پڑتا تھا مگر کبھی اس کی بس نکل جاتی، کبھی وہ خود ہی لیٹ ہو جاتی تھی باوجود کوشش کے، جس کی وجہ سے اکثر اسے مسز نادر کی خفگی سہنی پڑتی تھی حالانکہ مہینے میں شاید دو تین بار ہی ایسا ہوتا تھا مگر مسز نادر اسے بخشنے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ نہ جانے کیا پرخاش تھی انہیں اس سے، اکثر ہی اپنے اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک سے اسے گھورتی رہتیں۔ ہاں کام کے سلسلے میں وہ کبھی بھی اس کی خامی نہیں نکال پائی تھیں۔ وہ اپنا کام بہت لگن اور ایمان داری سے کرتی تھی۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح اسے کسی کے ساتھ گپیں لڑانے کا بھی شوق نہیں تھا پھر اسے ابھی فقط تین مہینے ہی ہوئے تھے یہاں جاب کرتے ہوئے۔ کلرک کم ریسپشنسٹ تھی وہ یہاں پر، تنخواہ

بہت اچھی اور جاب اس کی ضرورت سو وہ مسز نادر کو برداشت کر ہی لیا کرتی تھی۔

بیٹھنے سے پہلے اپنی کرسی کے بالکل پیچھے بنی گلاس ونڈو سے باہر کی طرف جھانکا۔

آج صبح ہی سے موسم بڑا خوبصورت ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا کے ساتھ —— گھرے گھرے بادل گھر کر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا ابھی برس پڑیں گے۔ اس نے شیشے کے پار لان میں نظر آتے سبزے کو سرخوشی کے عالم میں دیکھا، سارے درخت اور بیل بوٹے گویا امڈتی ہوئی گھٹاؤں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

اس نے بڑے خوشگوار موڈ میں دراز سے رجسٹر نکالا اور ڈاکٹر دانیال کے مریضوں کے ناموں پر نشان لگا کر ان کی نئی لسٹ بنانے لگی۔

اسی وقت گلاس ڈور کھلا تھا اور اندر داخل ہونے والوں کے ساتھ ٹھنڈی نم ہوا کا جھونکا بھی اندر گھس آیا تھا۔

اس نے اسکارف درست کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

ڈاکٹر دانیال احمد کے بالکل پیچھے مسز باقر تھیں۔

مژگان نے ایک سرسری مگر محتاط نظر اندر داخل ہوتے ڈاکٹر دانیال پر ڈالی۔

ہمیشہ کی طرح سرد سپاٹ چہرہ تھا جس پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ”کبھی تو مسکرائے ہوں گے یا کبھی بھی نہیں۔“ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس نے اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر حیرانی سے سوچا۔

”السلام علیکم سر…!“ جیسے ہی وہ استقبالیہ کے قریب سے گزرا اس نے سرسری سے لہجے میں حسب معمول کہا۔

”وعلیکم السلام۔ آج کچھ زیادہ مصروفیت رہے گی، کوشش کیجئے گا، مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے سرسری سی نگاہ ڈالی تھی اس پر۔

”یس سر۔“ عادتاً اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے اس نے سر ہلایا تھا وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔

آج کا دن واقعی بہت مصروف گزرا تھا ایک کے بعد دوسرا مریض پھر فیس کا مسئلہ۔ بغیر اپائنٹمنٹ والوں سے نمٹنا۔ نئے اپائنٹمنٹ لینا، سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی تھی اسے۔ اب تو کلینک کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ آج تو مسز نادر سے ایک بار کے بعد دوبارہ سامنا بھی نہ ہوا تھا اور نہ ہی ڈاکٹر دانیال ایک بار بھی غصیلے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا تھا ورنہ دن میں ایک دفعہ تو وہ ضرور اسے جھاڑ پلاتا تھا۔ ظاہر ہے نئی تھی اور ابھی وہ کام سیکھ رہی تھی تو غلطیاں بھی کرتی تھی مگر وہ بخشنے والا نہ تھا سب کے سامنے ہی ڈانٹ دیا کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر ہی اس سے چڑ جاتی تھی۔ ہاں ایک بات تھی نجانے کیوں ہر مریض اس کی نرم دلی اور خوش اخلاقی کے گن گاتا ہی اس کے کمرے سے نکلتا تھا۔ تین مہینے گزرنے کے بعد بھی یہ بات اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے میں مصروف تھی، تب ہی کوئی گلاس ڈور کھول کر اندر داخل ہوا اور تیزی سے اپنے کام میں مصروف اس کے ہاتھ تھم سے گئے۔ گرے ساری میں ملبوس ان خاتون کو وہ بے اختیار ہی دیکھنے لگی۔

قیمتی ساری اپنی قیمت کے بارے میں آپ سرگوشیاں کرتی معلوم ہو رہی تھی، اور وہ خاتون خود بھی بہت گریس فل اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ ڈاکٹر دانیال کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”ڈاکٹر صاحب تو گلا گھونٹ دیں گے اگر یہ خاتون یوں ان تک پہنچ گئیں تو۔“ انہیں ڈاکٹر دانیال کے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر اسے فوراً ہی ہوش آیا تھا دراز کھلی چھوڑ کر وہ ان کی طرف لپکی۔ حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کا آخری مریض کمرے سے نکل کر جا چکا تھا۔

”میرا خیال ہے، آپ راستہ بھول گئی ہیں۔ پرائیوٹ رومز اس طرف نہیں ہیں۔ آپ مجھے روم نمبر بتا دیجئے میں آپ کو گائیڈ کر دیتی ہوں۔“ اس کی نرم اور خوبصورت آواز پر وہ خاتون ٹھٹھک کر اس کی طرف مڑیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ لیے وہ ان سے ہی مخاطب تھی۔

ٹی پنک کلر کے کاٹن کے لباس میں جو بہت قیمتی نہیں تھا مگر خوبصورتی اور نفاست سے سلا ہوا تھا۔ سفیدی مائل رنگت پر خوبصورت بے حد گھنی پلکوں والی سیاہ آنکھیں، کھڑی ناک اور گلابی سے ہونٹ جو مسکرانے کے انداز میں پھیلے ہوئے تھے اور یوں مسکرانے سے گالوں میں پڑتا گڑھا۔ وہ اسے بے اختیار ہی دیکھے چلی گئیں۔

”مجھے ڈاکٹر دانیال سے ملنا ہے۔ آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ انہیں انفارم کر دیں تو۔“ شخصیت کی طرح ان خاتون کی آواز بھی اچھی تھی۔

”آئی ایم ساری میڈم!“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے معذرت کرنا پڑی۔ ”ڈاکٹر صاحب نے سختی سے کہا ہے کہ انہیں کسی بھی قیمت پر ڈسٹرب نہ کیا جائے سوائے ایمرجنسی کے۔ میں آپ کا اپائنٹمنٹ لے سکتی ہوں۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرا دی۔

”اچھا!“ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ ”آپ ان سے صرف یہ کہہ دیں کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔“ خاتون اچانک ہی مسکرانے لگیں۔

”شاید کوئی جاننے والی ہیں۔“ ان کی مسکراہٹ سے وہ یہی اندازہ کر پائی۔ تب ہی نہ چاہتے ہوئے بھی انٹرکام کا بٹن پش کیا تھا (نام پوچھے بغیر)۔

”سر! ایک خاتون آئی ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”خاتون آئی ہیں۔“ جس طرح دہرایا گیا تھا اس کے لہجے کو اسے فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کیا غلطی کر بیٹھی ہے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

”مس حسن…!“ اس کی سرد آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے بلاوجہ ڈسٹرب نہ کیجئے گا۔ مگر آپ بھی نا… اب میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ کوئی اس طرح آ جائے تو اس کا نام بھی پوچھ لیں۔ دیواروں کے پار دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہے مجھ میں کہ آپ کہیں اور میں سمجھ جاؤں کہ کون آیا ہے۔“ وہ خشک لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”یا الٰہی! کس قدر بے ہودہ آدمی ہے یہ۔“ اس کو ایک دم ہی غصہ آیا تھا۔

”یقیناً آپ نے کہا تھا سر کہ آپ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے لیکن اب تو…“ اچھا خاصا ضبط کر کے وہ اس سے دوبارہ مخاطب ہوئی تھی۔

”تو آپ کے خیال میں، میں نے مذاق کیا تھا آپ سے۔“ اس کی بات کاٹ دی گئی تھی ترش لہجے میں۔

جتنا برا لہجہ تھا اس کا اس کی بات سن کر اس سے کہیں زیادہ غصہ آیا تھا اسے شاید پہلی بار۔

”ٹھیک ہے سر! مجھ سے غلطی ہو گئی، نام نہیں پوچھا میں نے ان کا، مگر آپ کو کم از کم خواتین سے بات کرتے ہوئے اپنے الفاظ اور لہجے پر ضرور توجہ دینا چاہیے۔“ اس کا دھیما لہجہ اچھی خاصی ترشی لیے ہوئے تھا۔

”اس سے کہیں، میں اس کی ماں ہوں۔“ اس کا سرخ چہرہ اور الفاظ سن کر خاتون یکایک گھبرا گئی تھیں تبھی درمیان میں بول پڑی تھیں۔

”آپ کی مدر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ لہجے پر قابو پاتے ہوئے جواب کا انتظار کیے بغیر دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کی مدد سے رابطہ منقطع کیا اور غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”آئی ایم ساری بیٹے!“ خاتون کی معذرت ابھی ان کے منہ ہی میں تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔

”آپ مجھے پہلے نہیں بتا سکتی تھیں۔ ضروری تھا کہ آپ کو یہ جھیلیں۔“ دوسرے ہی لمحے وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سیاہ آنکھیں بڑے غصیلے انداز میں اس پر جمی تھیں۔

”جی ہاں سر! میں نے کہا تو ہے کہ میری ہی غلطی تھی میں نے ان کا نام نہیں پوچھا تھا۔“ ضبط کر کے سرخ چہرہ لیے اس نے جواب دیا تھا مدھم لہجے میں۔

ایک دم ہی وہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر پلٹ گیا فوراً ہی ایک لفظ کہے بغیر۔

”بس نکلتے ہیں ماما۔ میں تقریباً فارغ ہی ہوں۔“ وہ بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا تھا۔

”بالکل ال مینرڈ، جاہل۔“ اس کی ساری ڈگریاں

نظر انداز کر کے وہ بے ساختہ بڑبڑائی تھی۔

دروازے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

"خیریت تو ہے ماما! آپ آج یہاں میرے کلینک پر؟" فرنٹ ڈور ان کے لیے کھول کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا تھا۔

"ہاں۔ سب خیریت ہے۔" انہوں نے بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔

"کیا بات ہے۔ ایسے آتی تو نہیں ہیں آپ یہاں پھر آج۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے مسکرا کر دیکھا تھا انہیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ نے پورے وجود کو جگمگا دیا تھا۔

"وہ لڑکی کون تھی؟" سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر انہوں نے اچانک ہی پوچھا۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس کی ماں اپنے اندر جو دماغ رکھتی تھی وہ بعض اوقات ادھر ادھر چھلانگیں لگا دیتا تھا بغیر کسی وجہ کے۔

"مس مژگان احمد!" اس نے بتایا۔

"اس نے تمہیں اپنے لہجے اور الفاظ پر توجہ دینے کے لیے کہا تھا۔" وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں۔ انہیں پتا تھا اپنے کام میں بڑا سخت ہے ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کرتا تھا۔

"جی اس کے لیے میں اسے فارغ بھی کر سکتا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! آپ مالک جو ہیں اور وہ آپ کی نوکر۔" ان کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

"تم اسے فارغ نہیں کرو گے۔"

"یقیناً نہیں کروں گا کیونکہ ابھی سیکھ رہی ہے اور کام بہت اچھا کرتی ہے مگر آپ۔" وہ ذرا سا الجھ کر انہیں دیکھنے لگا۔

"مجھے وہ لڑکی اچھی لگی ہے۔" وہ کہنے لگیں۔

"پھر؟" وہ بالکل خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"اس کو تم کہیں اور سیٹ کردو۔"

"کہاں؟ کیا مطلب؟" وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ نجانے کیا خیال تھا ان کے دل میں۔

"میں تمہارے پاس اماں بی کی وجہ سے آئی تھی دو تین روز سے طبیعت خراب چل رہی ہے اِفراء تقریباً روز ہی چکر لگالیتی ہیں۔ گر کب تک کریں گی ان کا بھی تو گھر ہے سارا مسئلہ یہ ہے کہ نہ وہ اس بات پر تیار ہیں کہ ان کے لیے کوئی نرس وغیرہ رکھ دی جائے اور نہ ہی وہ ہمارے پاس آنے کو تیار ہیں۔ تو پھر یہی سوچا تھا تمہارے پاپا نے کہ کوئی ایسی پڑھی لکھی خاتون ان کے لیے رکھ دی جائیں جو دن رات ان کے ساتھ رہ سکیں اور انہیں کمپنی بھی دے سکیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر لگا کہ وہ اماں جی کے ساتھ سیٹ ہوجائے گی۔ تین مہینے سے تمہارے ساتھ کام کر رہی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ ہر قسم کے حالات میں کام کر سکتی ہے اور قوت برداشت بھی یقیناً بہت ہوگی اس کے اندر۔" انہوں نے تفصیل سے وضاحت کی۔

"یعنی اماں اس کے ساتھ خوش رہیں گی؟" مسکراہٹ ضبط کر کے ان کی طرف مڑا۔

"میرا خیال ہے ایسا ہوگا۔ ویسے تو میں کچھ بھی نہیں جانتی اس لڑکی کے بارے میں، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے وہ اچھی لگی ہے۔ مانوس مانوس سی۔ یہ میرے احساسات بھی ہو سکتے ہیں۔ تم اس لڑکی سے بات کرو ہم سب بہت پریشان ہیں اماں بی کے لیے۔ ظاہر ہے ابا میاں بھی انہیں چھوڑ کر نہیں آسکتے اور وہ ان کا آخر کتنا خیال رکھیں گے۔ وہ تو اس گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتیں۔ پتا نہیں ان کا انتظار آخر کب ختم ہوگا۔"

ایک دم ہی ماما کی آنکھیں نم ہوئیں تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے میں بات کرلوں گا مس حسن سے۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"ہاں کرلو۔ میں کل پھر آؤں گی تمہارے کلینک۔"

"ٹھیک ہے ماما! لیکن وہ انکار بھی تو کر سکتی ہے۔"

"کسی بھی قیمت پر اسے راضی کرو۔"

"دیکھتا ہوں کوشش کر کے۔" اس کا لہجہ بے یقینی لیے ہوئے تھا۔

"مگر مجھے لگتا نہیں ہے کہ وہ یوں اپنا شہر چھوڑ کر بلکہ کسی کے گھر رہنے پر تیار ہوجائے گی۔" اس کا مہذب انداز اس کا رکھ رکھاؤ ڈاکٹر دانیال احمد کی توجہ کھینچ لیتا تھا اپنی طرف۔

"اچھا تم رہنے دو۔ میرا خیال ہے تم بات کرو گے تو وہ راضی ہوتے ہوئے بھی انکار کردے گی۔" انہوں نے کہا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"میں خود ہی بات کرلوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً تیار ہوگیا تھا۔

"اگر تیار ہو بھی جاتی ہے وہ تو کیا اس کے گھر والے اجازت دے دیں گے؟ پتا نہیں کہاں رہتی ہے، کس فیملی سے ہے دیکھنے میں تو اچھی فیملی سے لگتی ہے۔" وہ باآواز بلند سوچنے لگیں اس کے بارے میں۔

"اندازاً" کچھ پتا ہے کہاں رہتی ہے؟" جواباً اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"شاباش ہے بیٹا تم پر۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"کلینک کے ریکارڈ سے لے لیجیے گا ایڈریس۔" اس نے مشکل آسان کی۔

"ہوں..... ٹھیک ہے۔" وہ مسکرادیں تھیں۔

دوسرے دن وہ آئی ہی نہیں تھی اور ایڈریس دیکھ کر وہ قدرے حیران ہوا کہ وہ ویمن ہاسٹل میں رہتی ہے۔

کوئی شام چھ بجے شیر محمد ہاسٹل انچارج مسز نایاب کا پیغام لایا تھا اور پیغام سن کر وہ چائے پینا بھول گئی تھی۔

"ڈاکٹر دانیال اور ان کی مدر آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"اللہ خیر، پہلی چھٹی تو کی تھی ان پورے تین سالوں میں۔" وہ اسکارف سر پر لیتی مسز نایاب کے کمرے میں چلی آئی۔ سامنے ہی ڈاکٹر دانیال اپنے ماں کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تھا۔

"مژگان بیٹے! یہ مسز نواز آپ سے ملنا چاہتی

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

ماہنامہ حنا لاہور

ستمبر 2004 کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

ستمبر 2004ء کے شمارے کی ایک جھلک

- معروف اداکار، گلوکار ظفر علی سے ملاقات،
- اس ماہ کی شخصیت، ہاکی کے کھلاڑی اعجاز کھوکھر سے باتیں،
- "حاصل زیست"، شمع ظفر کا دلکش مکمل ناول
- شاکرہ ناز کا خوبصورت مکمل ناول "سحر ہونے کو ہے"
- قدسیہ یاسمین کا ناولٹ "رشتے محبتوں کے"
- "سکھ ماہی نال لے گیا" عظمیٰ گوہر کا ناولٹ،
- صاعقہ ملک، سباس گل، راحیلہ سمیع، مناہل بٹ اور نبیلہ ابر راجہ کے افسانے،
- "ساحلوں کی اُداسی" زرین آرزو کا سلسلے وار ناول
- سیما بنت عاصم کا سلسلے وار ناول "عشق کے روگ ہزار سائیں"

اس کے علاوہ

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں، انشا نامہ، انٹرویوز، شوبز کی دُنیا کی دلچسپ معلومات اور حنا کے مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ستمبر 2004ء کا شمارہ

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

تھیں۔ غالباً" آپ دانیال صاحب کے کلینک میں جاب کر رہی ہیں یہ ان کی مدر ہیں۔"

"جی۔۔!" سلام کر کے وہ سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"مژگان! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے بلکہ میرا خیال ہے میڈم! میں یہیں آپ کے سامنے ہی ہر بات کرلوں تاکہ آپ میری گارنٹی تو دے سکیں کم از کم۔"

وہ ہلکے سے مسکرائیں۔ مسز نایاب کو دیکھ کر وہ کچھ بھی کہے بغیر انہیں دیکھتی رہی۔ تب انہوں نے بولنا شروع کیا۔

ساری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کرے۔

"میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گی۔" کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

دانیال احمد نے دیکھا سرخ لان کے سوٹ میں بلیک اسکارف لیے سوچوں کے سارے رنگ اس کے چہرے پر تھے۔

"میں مسٹر اینڈ مسز نواز کی فیملی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں مژگان بیٹا! تمہیں ایسا لگے گا کہ تم اپنے ہی گھر میں رہ رہی ہو۔ اور انہیں بھی اطمینان رہے گا کہ کوئی ان کی ماں کی دیکھ بھال کرنے والا تو ہے۔" مسز نایاب شفیق انداز۔۔ میں کہہ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم اچھی طرح سوچ لو بیٹے! آج کل کا ماحول ہی ایسا ہے کہ لوگوں پر اعتبار مشکل ہی سے آتا ہے۔ تم اگر تیار ہو جاتی ہو تو یہ ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان ہو گا تمہارا۔ ان بوڑھے لوگوں پر جنہیں کسی کا انتظار راتوں کو بھی سونے نہیں دیتا۔" بے اختیار ہی ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ عجیب سا احساس لیے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کی کہانی دوسرے، بہت سے لوگوں کی طرح بڑی عام سی تھی۔ اس کے پاپا مشرقی پاکستان سے اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آئے تھے وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔

اس نے اپنی ماں کو کبھی کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ اکثر ہی اسے ان کی آنکھوں میں نمی نظر آتی تھی۔ جب تک وہ دونوں زندہ رہے۔ زندگی کی پری اس پر بہت مہربان رہی تھی۔ وہ اپنے ماسٹرز کے آخری سمسٹر سے فارغ ہوئی تب اچانک ہی اس کے پاپا کا کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا یہ حادثہ اس کے لیے تو شدید تھا ہی لیکن اس کی ماں اس حادثے سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی تھیں اور بیمار رہنے لگی تھیں تب اسے یوں لگا زندگی کی مہربان پری نے آہستہ آہستہ اپنے پر سمیٹنے شروع کر دیے ہوں۔ اس کا گھر اچھا خاصا تھا مگر اسے چلانے کے لیے پیسہ چاہیے تھا۔ رزلٹ کے بعد اس نے کئی جگہوں پر جاب کی تھی مگر چونکہ یہ معاشرہ مردوں کا ہے۔ لہٰذا وہ کسی بھی جگہ زیادہ دن لگ کر کام نہیں کر سکی۔ جس دن اس کی ماں نے اس کا ساتھ چھوڑا' اس دن صحیح معنوں میں اسے لگا کہ کسی نے اچانک ہی گھنے سایہ دار شجر کے نیچے سے اٹھا کر اسے تیز جھلستی دھوپ میں لا کھڑا کیا ہو۔ اکیلے گھر میں بہت سی ایسی راتیں تھیں جو اس نے اپنے بستر میں بیٹھ کر جاگ کر تنہا روتے ہوئے' خوف کھاتے ہوئے گزار دی تھیں۔

زندگی اس پر کب مہربان ہو گی۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتی تھی۔

اور جس رات اس کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ کسی منچلے کے پھینکے ہوئے پتھر سے ٹوٹا اس کے تیسرے دن ہی اس نے اپنا گھر جہاں وہ پیدا ہوئی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی چھوڑ دیا تھا اور ایک وومن ہاسٹل میں پناہ لے لی' جو اس کی ایک یونیورسٹی فرینڈ کے جاننے والوں کا تھا۔ یہاں کا ماحول اچھا تھا وہ خاصی مطمئن ہو کر کسی جاب کی تگ و دو میں لگ گئی۔ شاید حالات ابھی کچھ مہربان تھے کہ کچھ عرصہ قبل ہی اسے "احمد کلینک" میں جاب مل گئی تھی اور اپنی پرانی جاب کو خیر آباد کہہ کر وہ نئی جاب میں مگن ہو گئی یہاں کا ماحول اس کی طبیعت کے عین مطابق تھا۔

☼ ☼ ☼

جس وقت وہ دانیال احمد اور اس کی ماں کے ساتھ اس بڑے سے خوبصورت مگر قدیم انداز کے بنے ہوئے سیاہ گیٹ والے گھر کے سامنے اتری تو اس وقت ماحول پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ فضا میں اڑتے پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف محو پرواز تھے۔

"کیا کبھی وہ بھی زندگی کو پر سکون انداز میں برت سکے گی۔" اس نے ہواؤں میں اڑتے پرندوں کو دیکھ کر سوچا اور آنکھوں میں آئی نمی حلق میں اتار لی۔

دانیال احمد کے کال بیل بجانے سے لے کر گیٹ کھلنے تک کے عمل کے دوران وہ باہر ہی سے تیسری منزل تک جاتی سرخ گلابی پھولوں والی سر سبز بیل کو جو کہ گھر کے اندرونی حصے میں لگی ہوئی تھی پسندیدہ نظروں سے دیکھتی رہی جس کے پھول جھانک جھانک کر اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

"ارے دانی بیٹا' آیا ہے۔ سلام بیٹا!" نور دین بابا انہیں دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرائے پھر مسز نواز کو سلام کیا۔

"ٹھیک ٹھاک ہیں نور دین آپ؟" مسز نواز ان کی خیریت پوچھنے لگیں۔

"اماں بی کیسی ہیں بابا؟" دانیال ہاتھ ملا کر نور دین بابا سے اماں بی کی خیریت دریافت کرنے لگا تھا۔

"تم اندر آجاؤ مژگان!" مسز نواز کی آواز پر اس نے گیٹ کے اندر قدم رکھ دیے۔

"اب تو بہت بہتر ہیں بیٹا۔"

"افراء آئی تھیں؟" وہ اس کو۔۔ ہاتھ سے اپنے آنے کا اشارہ کر کے نور دین بابا کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔

آئی تھیں مگر بی بی نے واپس بھیج دیا۔" گہرا سانس لے کر وہ خاموش ہو گئیں۔

گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف ہرا بھرا سا لان تھا پھر تین زینے چڑھ کر جن پر دائیں بائیں کے بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے بر آمدہ شروع ہوتا تھا اور بر آمدے کے بعد رہائشی کمرے۔

لاؤنج سے ہوتے ہوئے وہ ایک کمرے کے دروازے پر آن رکے۔

"جاگ رہی ہیں اماں!" دانیال نے اندر جھانک کر انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جس کمرے میں وہ لوگ داخل ہوئے کھلی کھڑکی سے لان کا منظر بھی نظر آرہا تھا۔

چھت کو تکتے ہوئے سامنے ہی بیڈ پر سفید بالوں اور نرم سے نقوش والی خاتون لیٹی نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"السلام علیکم اماں بی!"

"آ گئے تم لوگ۔" سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"میں بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی تم لوگوں کا۔ افراء کہہ رہی تھی کہ شاید آج تم لوگ آؤ گے یہاں۔" انہوں نے پہلے مسز نواز کو گلے لگایا پھر دانیال کو لپٹا کر بولیں۔ "افراء کو کیوں واپس بھیج دیا اماں؟" وہ ذرا سے ناراض لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"بیٹا! اس کا بھی تو گھر ہے' بچے ہیں' آج محتشم کچھ نہیں کہے' کل کو کچھ کہہ دیا تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری۔"

"محتشم ایسے نہیں ہیں بلکہ وہ تو خود آتے ہیں اسے لے کر۔"

"نیک ماں باپ کی اولاد ہے بیٹا! وہ خیال کر لیتا ہے تو ہمیں بھی تو خیال رکھنا چاہیے نا وہ چکر لگاتی رہتی ہے تو تسلی رہتی ہے آپ لوگوں کی طرف سے۔"

"بیٹا! اب وہ روز روز تو بھاگ کر نہیں آسکتی نا۔"

"آپ سے نہیں جیت سکتی میں۔" وہ ذرا سا جھنجھلا گئیں۔

"ابا میاں کہاں ہیں؟" دانیال نے پوچھا۔ "کتابوں والے کمرے میں ہوں گے اور کہاں جائیں گے۔"

"میں ابا میاں سے مل لوں۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا اور پھر نظر دائیں طرف کھڑی مژگان احمد حسن پر پڑی جو خاموش کھڑی تینوں کو بولتا دیکھ رہ تھی۔

"ارے اماں بی سے ان کا تعارف تو کرا دیں۔" وہ

وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

"یہ کون ہے ثوبیہ؟" اماں بی نے اب دیکھا تھا اسے۔

"سوری مژگان بیٹا! میرا دھیان ہی ہٹ گیا تھا تمہاری طرف سے۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"اماں جی! یہ مژگان ہے۔" وہ اس کے بارے میں انہیں بتانے لگیں۔

"السلام علیکم!" ہلکے سے مسکرا کر کہا۔ گالوں پر پڑتے گڑھے نے انہیں ہلکا سا چونکایا۔

"خوش رہو۔" عجیب سی مانوسیت کا احساس لیے وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ادھر آؤ میرے پاس۔"

آنکھوں میں سنجیدگی اور ذہانت و معصومیت کا امتزاج لیے وہ انہیں جانے کیوں اپنی اپنی سی لگی تھی۔

"کیا نام بتایا تم نے اس کا ثوبیہ! بیٹا پورا نام کیا ہے تمہارا؟"

"مژگان احمد حسن۔" وہ پر اعتماد مسکراہٹ لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔

بالکل سیاہ گھنی گھنی پلکوں والی بڑی بڑی آنکھیں۔ انہیں ایک دم سے لگا جیسے ان آنکھوں سے کوئی اور انہیں دیکھ رہا ہو۔

"احمد حسن تمہارے ابا کا پورا نام ہے؟" انہوں نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"جی... احمد حسن ہی ان کا پورا نام ہے۔" وہ قدرے حیران نظر آئی تھی۔ "اچھا تم بیٹھو تو بیٹا! کب سے کھڑی ہو۔" انہوں نے جیسے ذرا سا مایوس ہو کر اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"تھینک یو۔" وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ لوگ باتیں کریں تب تک میں ابا میاں سے مل آؤں ذرا۔" مسز نواز کھڑی ہو گئیں۔

"کچن میں نہ گھس جانا۔ زرینہ سے کہہ کر بنوا لیا تھا میں نے رات کا کھانا۔"

وہ اچھا کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

"آپ لیٹ جائیے۔" اسے لگا وہ قدرے بے چین ہیں تب ہی وہ بول اٹھی۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" روشن سی مسکراہٹ لیے وہ بڑے نرم لہجے میں اس سے بولیں۔

"تمہاری پڑھائی مکمل ہو گئی ہے؟"

"جی ماسٹرز کیا ہے میں نے۔" اس نے بتایا۔

"ماشاءاللہ۔ کہاں رہتی ہو؟"

"اسلام آباد میں۔"

"تمہارے گھر والوں نے اجازت دے دی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر آنے کی اور بالکل انجان لوگوں میں رہنے کی۔" وہ سادگی سے پوچھنے لگیں۔

"گھر..." آنکھوں کی نمی پر قابو پا کر وہ ہلکے سے مسکرادی۔ "میں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔"

"اچھا!" انہوں نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا تھا بلکہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔

"تم بھی آرام سے بیٹھو... تھک گئی ہو گی۔" تھوڑی دیر بعد وہ اس سے بولیں۔

"کوئی اتنا لمبا سفر بھی نہیں تھا۔" وہ خوش دلی سے مسکرادی۔

"سفر لمبا ہو یا مختصر، سفر ہی ہوتا ہے۔ کبھی آدمی لمبے سفر سے نہیں تھکتا کبھی مختصر سفر بھی اسے تھکا ڈالتا ہے۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہنے لگیں۔

"نہیں۔ مجھے آپ کے پاس بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔" ایک دم ہی اس کے منہ سے نکلا۔

اور واقعی یہ حقیقت تھی کہ اسے ان سے بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ ایک دم ہی چپ ہو کر اسے دیکھنے لگیں جو اپنی بات کہہ کر قدرے نادم نظر آ رہی تھی۔

"اور مجھے بھی ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ کوئی مانوس سی خوشبو میرے ارد گرد ہے جو مجھے سکون دے رہی ہے ایک مانوس سا احساس ہے جو مجھے بار بار چونکا رہا ہے۔ مگر تم وہ نہیں ہو اس سے تمہارا کوئی تعلق بھی نہیں ہے پھر تم اسی کا حصہ کیوں لگ رہی ہو۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا سی گئی تھیں۔

"ماں باپ ہیں تمہارے؟" تھوڑی دیر بعد وہ پوچھ

رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ مختصراً اپنے بارے میں انہیں بتانے لگی۔

"بہت بہادر ہو تم۔" انہوں نے بڑی اپنائیت سے اسے گلے لگایا۔

"آپ تھوڑی دیر لیٹ جائیں۔" ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اسے لگا کہ وہ تھک سی گئی ہیں۔

"ہاں۔ میں اب لیٹوں گی تھوڑی دیر۔" نرم لہجے میں کہتے ہوئے وہ لیٹ گئیں۔

اب وہ کیا کرے۔ تھوڑی دیر تک تو وہ انہیں بیٹھی دیکھتی رہی پھر ان کے بیڈ کے ساتھ رکھی سائیڈ ٹیبل پر سے "قصص الانبیا" اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔

"مس حسن!" کوئی پندرہ منٹ بعد وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ انہماک گہرا تھا تو اس کے آنے کا پتا ہی نہیں چل سکا اسے، لہٰذا بے اختیار ہی کتاب اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔

"س سوری سر۔" جانے کیوں اسے لگا وہ خفیف سا مسکرایا ہو۔

"سو گئیں اماں بی۔" اس نے جھک کر اماں بی کو دیکھا۔

"جی... بس تھوڑی دیر پہلے۔"

"مس حسن! آپ کو یہاں ایسا ہی لگے گا جیسے آپ اپنے گھر میں ہیں۔ ویسے تو میرا خیال ہے یہاں آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہو گی اگر خدانخواستہ کوئی بات ہو تو آپ اس نمبر پر مجھ سے کسی بھی وقت کانٹیکٹ کر سکتی ہیں۔" اپنے پرسنل سیل کا نمبر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اماں بی! صبح ناشتے کے بعد اور رات کو سونے سے پہلے دوائیں لیتی ہیں۔ وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔"

اس کا لہجہ اپنے کلینک کے برعکس اس وقت نہایت ہی نرم تھا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ سر ہلانے لگی۔

☼ ☼ ☼

اس گھر اور گھر میں رہنے والے ان دونوں افراد سے مانوس ہونے میں اس نے کچھ زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ شروع شروع میں اگر کچھ ڈر و خوف تھا تو اماں بی کی محبت و عنایت دیکھ کر تو وہ اب کہیں دور جا بیٹھا تھا۔

نرم نرم نقوش والی سفید غرارہ اور نفیس سی بیل لگا چار موم کا دوپٹہ اوڑھے ہر ایک سے بلا امتیاز محبت کرنے والی اماں بی اسے پرانی کہانیوں کا کوئی کردار لگا کرتی تھیں۔ اکثر اسے اپنے پاس بٹھا کر نا معلوم کون سے قصے بار بار سنایا کرتی تھیں، جنہیں ہر مرتبہ وہ اسی دلچسپی سے سنا کرتی جس دلچسپی سے پہلی بار سنا تھا۔

سفید ململ کا نفیس سا کرتا اور کاٹن کا پائجامہ، سنہرے کمان کی عینک اور سیاہ دستے والی لکڑی کی چھڑی جو وہ اکثر باہر نکلتے ہوئے استعمال کرتے تھے۔ سفید عمدگی سے تراشی گئی داڑھی اور سر پہ اوڑھی ٹوپی۔ یہ ابا میاں تھے، خاموش خاموش، ہمہ وقت کچھ سوچتے ہوئے، وہ زیادہ تر اپنی اسٹڈی ہی میں رہا کرتے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق اسے ان کے قریب لے آیا تھا۔ پہلی بار وہ بھی جب اس سے ملے تو چونک گئے تھے اماں بی کی طرح، اور وہ سمجھ نہ پائی تھی کیوں؟

اماں بی کے دو بیٹے تھے۔ چھوٹے بیٹے لاہور میں رہتے تھے اپنی جاب کی وجہ سے اور بڑے بیٹے جو کہ دانیال احمد کے والد تھے وہ اسلام آباد میں رہ رہے تھے اپنے بزنس کی وجہ سے۔ دانیال کو اماں بی نے ہی پالا تھا مگر اب وہ اپنے کلینک کی وجہ سے ان سے دور ہو گیا تھا۔ وہ ان کے بڑے بیٹے کا دوسرے نمبر کا بیٹا تھا۔

بڑے پوتے کی شادی افرا آنٹی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ افرا آنٹی جو اماں جی کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ اکثر شام کو وہ انکل کے ساتھ آجایا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ بھی وہ بڑی محبت سے پیش آتی تھیں۔ اس نے اماں بی کے دونوں بیٹوں اور ان کے بچوں میں سوائے دانیال احمد کے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا، لیکن انہوں نے تعارف اتنی تفصیل سے کروایا ہوا تھا کہ اسے لگتا تھا کہ وہ انہیں جب بھی دیکھے گی پہچان لے گی۔

تقریباً روز ہی ابا میاں یا اماں بی کے پاس دانیال احمد کا فون آجاتا تھا۔ اسے تو اس گھر میں آنے کے بعد کبھی

بھی یہ نہیں لگا کہ وہ یہاں جاب کر رہی ہے کسی قسم کی۔ اتنی محبت کرنے والی اماں بی اور اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو دینے والے شفیق سے ابا میاں کی غلامی تو وہ شاید ساری زندگی کر سکتی تھی۔

"اماں جی! آپ ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟" ایک دن جھجکتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

"مجھے یہیں اس گھر میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ پھر... پھر کسے معلوم وہ کب آجائے لوٹ کر۔" بولتے ہوئے ان کی آنکھیں ایک دم سے جھلملا گئیں۔ "اور اگر وہ آئے اور ہم نہ ملیں اسے گھر میں تو کہیں وہ پھر سے مایوس نہ ہو جائے۔"

وہ حیرت اور ہمدردی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ پوچھ نہ پائی انہیں کس کا انتظار ہے۔

صبح وہ حسب عادت جلد ہی اٹھ گئی تھی۔

اماں بی اس سے پہلے ہی اٹھ چکی تھیں اور اب نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہی تھیں، وہ وضو کرنے باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

کپکپاتے لب اور بوڑھی آنکھوں سے بہتے آنسو... وہ جاء نماز بچھاتے بچھاتے رک گئی تھی۔

"اے میرے اللہ میاں۔ میرے مالک، سب کی سنتا ہے میری بھی آج تک سنی ہے یہ گناہ گار بندی شکوہ نہیں کرتی۔ مگر مالک میرا صبر۔ میری عمر اور میری برداشت اب ختم ہونے کو ہے۔ میرے مالک میرا انتظار ختم کر دے۔ میرے پروردگار میری آزمائش اب ختم کر دے۔ ایک بار۔ بس ایک بار اس سے ملا دے، مجھے معافی دلا دے۔ مجھے میرا سکون لوٹا دے۔ مجھ گناہ گار کی التجاء تو سن لے۔ کانٹوں پر گزری ہے ہماری زندگی اس کے بعد، اتنی نعمتوں کے باوجود کڑی دھوپ جیسی گزری زندگی۔ اب تو ٹھنڈی ہوا چلا دے۔ کوئی پھول کھلا دے مالک، ہم پر رحم کھا لے اے بے نیاز۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

اس کے ہاتھ جاء نماز بچھانا بھول گئے تھے ان کے الفاظ نے اسے گویا اپنی جگہ پر منجمد کر دیا تھا۔

"کانٹوں پر گزری ہے اب تک کی ساری زندگی، کڑی دھوپ جیسی، کوئی پھول کھلا دے مالک، اب تو ٹھنڈی ہوا چلا دے۔ کوئی پھول کھلا دے مالک۔" اس کے اندر دور، بہت دور کوئی سسک رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر تحیر سے اماں بی کو دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا، وہ اماں بی سے پوچھے یہ دعا آپ کے علاوہ کیا کوئی اور بھی مانگ سکتا ہے۔

"تم اٹھ گئیں۔" اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر اشارے سے قریب بلا کر اس کے چہرے پر پھونک ماری۔

"اللہ ہر مصیبت سے بچائے رکھے۔"

☼ ☼ ☼

اماں بی سو رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا دھوپ کی شدت ذرا کم تھی ہر سو خاموشی سی چھائی ہوئی تھی نوردین بابا بھی شاید اپنے کوارٹر میں چلے گئے تھے۔ اس نے ایک نظر سوئی ہوئی اماں بی پر ڈالی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی "بدیسی مزاج" (پاکستانی لباس میں) اٹھا کر ان کی نیند خراب ہونے کا خیال سے دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ گرمیوں کی طویل دوپہریں ہمیشہ ہی سے اسے پسند تھیں۔

آج صبح ہی تو ابا میاں نے اسے یہ کتاب اپنی اسٹڈی سے لا کر دی تھی۔ وہ حسب عادت اپنی مخصوص جگہ پر کرسی ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔

انہوں نے عشق پیچاں کی سرسبز بیل کے نیچے کرسی ڈالے کتاب میں مگن مژگان کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

ہوا کے جھونکوں سے سرخ، سفید اور گلابی پھول وقفے وقفے سے اس کے سر، دوپٹے اور گود میں رکھی کتاب پر گر رہے تھے مگر وہ تو جیسے ہر چیز سے بے نیاز تھی۔ انہوں نے دیکھا ہلکی سی دھوپ اس کے بالوں پر بھی پڑ رہی ہے۔

کسی نے جھٹکے سے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ سر اٹھایا تو ابا میاں کھڑے تھے۔

"ابا میاں! پلیز تھوڑی سی رہ گئی ہے۔" بڑا بے ساختہ ملتجی سا لہجہ تھا۔ ایک دم ہی ان کا چہرا زرد پڑا تھا اور کتاب پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

دور، بہت دور جیسے کوئی اچک اچک کر ان سے کتاب چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابا میاں پلیز، تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ ایسے تو نہ چھینا کریں، اب پتا نہیں کون سے صفحے پر تھی۔"

"اتنی دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اندر جا کر پڑھو۔"

"کوئی اتنی دھوپ تھوڑی ہے ابا میاں۔ سائے میں تو بیٹھی ہوں، اتنی اچھی ہوا آ رہی ہے یہاں اور پھول بھی گر رہے ہیں۔"

"دے دیں نا ابا میاں... مجھے بس یہیں مزہ آتا ہے کتابیں پڑھنے میں۔" وہی ملتجی سی آواز۔

"سوری سر..." اس کی آواز پر وہ جیسے واپس آ گئے تھے انہوں نے دیکھا اپنی بے ساختگی پر وہ سخت شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

"تم باہر کیوں بیٹھی ہوئی تھیں؟" کتاب واپس کرتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ایسے ہی آ گئی تھی۔ اماں جی سو گئی تھیں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" اس نے آہستہ سے بتایا۔

"گرمی نہیں لگ رہی جو یوں باہر..." انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ بس سر، ایسے ہی۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"سر نہیں ابا میاں۔ تم نے ابھی مجھے ابا میاں کہا تو مجھے بہت اچھا لگا اب تم مجھے ابا میاں ہی کہا کرو۔" پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ واپس اندر چلے گئے تھے اسے حیران چھوڑ کر۔

☼ ☼ ☼

"مژگان! مژگان بیٹی۔" ان کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی مگر اپنی چپلوں میں الجھ کر منہ کے بل سامنے بنی کیاریوں پر جمائے گئے نوکیلے پتھروں پر گری۔ اسی وقت ڈور بیل بھی بجی تھی۔

"اف" ایک لمحہ کو تو آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔ بے اختیار ہی ہاتھ سر پر گیا تھا اسے اپنے ہاتھ پہ نمی سی محسوس ہوئی۔

"کیا ہوا بیٹے؟" اماں بی جواب نہ ملنے پر خود ہی آ گئیں۔

"کچھ نہیں اماں بی... میں گر گئی تھی۔" تکلیف کے مارے آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر بے سود۔ سر الگ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

"خون نکل رہا ہے۔" ان کی نظر اس کے سر پر رکھے ہاتھ پر پڑی تھی جہاں سے خون نکل رہا تھا۔ بیل ایک دفعہ پھر بجی۔

"اماں بی! گیٹ پر کوئی ہے۔" ہمت کر کے وہ بیٹھ گئی۔

"ہاں نوردین گیا ہے کھولنے۔"

"کیسے گر گئیں بیٹا؟" خون دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

جواب دینے سے قبل ہی کسی نے بڑے آرام سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا یوں کہ تکلیف سے اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"یہ دانیال یہاں کہاں سے آ گیا، آج اتنی تکلیف میں بھی اس نے حیرت سے سوچا۔

نہ وہ ابھی تک کچھ بولا تھا اور نہ ہی اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"اسے کیسے پتا چلا کہ یہ ڈاکٹر دانیال ہی ہے۔" خود اپنے سوال پر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔

"ہاتھ ہٹائیے مس حسن...!" تب ہی اس کی آواز آئی تھی۔ اس نے ہاتھ ہٹا لیے۔

"زخم تو گہرا لگ رہا ہے خون کافی بہہ رہا ہے۔ اسٹیچنگ ہو گی۔"

پہلی بار اسے بغیر اسکارف کے دیکھ رہا تھا، گھنے سیاہ چمکیلے بالوں کا آبشار اس کے ہاتھوں کے نیچے پھسل رہا تھا، غالباً تھوڑی دیر پہلے نہائی تھی بالوں میں نمی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"بال کاٹنے پڑیں گے۔ اماں بی! نوردین بابا سے باکس منگوالیں۔" وہ خود ہی اندر کی سمت چل دیں۔

"کیا! بال کٹیں گے؟ رہنے دیں کچھ لگالوں گی ایسے ہی زخم ٹھیک ہوجائے گا۔" وہ بالوں کے کٹنے کا سن کر ڈر گئی تھی۔

"میرے بال چھوڑیں۔" اس کی گرفت سے اپنے بال چھڑانے چاہے۔

"یہ کیا بچکانہ پن ہے مس حسن!" یکا یک ہی اس کا لہجہ بدلا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ میں آپ کی زلفوں کو پکڑے بیٹھا رہوں۔ زخم کے چاروں طرف سے بال بھی صاف ہوں گے اور اسٹچنگ بھی ہوگی۔"

وہی پرانا توہین آمیز لہجہ۔

وہ سر سے پاؤں تک تپ گئی اس کی پہلی بات سن کر۔ دوسری تو کانوں میں گئی ہی نہیں تھی۔

"نہیں کروانی مجھے اسٹچنگ، میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ خواتین سے گفتگو کرتے وقت آپ ذرا محتاط رہا کیجیے۔ چھوڑیں میرے بال۔"

جھٹکے سے اپنے بال چھڑائے اور اٹھ کھڑی ہوئی مگر نظر کے آگے جگمگاتے تاروں اور سر میں اٹھتی ٹیسوں نے اسے دوبارہ کرسی پر گرادیا تھا۔ تکلیف کے مارے آنسو آگئے۔

"آرام سے بیٹھ جائیے۔" لہجہ قدرے بدلا تھا شاید اس کی تکلیف کا احساس کرکے۔

"آخر یہ سر پھوڑا کیسے آپ نے۔" اس سے زیادہ چپ نہ رہا جاسکا وہ کڑھ کر رہ گئی "اماں بی نے آواز دی تھی میں بس اٹھ ہی رہی تھی کہ چپلوں میں پیر الجھ گیا اور میں گر گئی۔" خون کے گھونٹ پی کر پورا واقعہ بتایا مختصر الفاظ میں۔

"آرام سے چلی جاتیں آپ، اماں بی توپ سے تو نہ اڑا دیتیں آپ کو۔"

"ہاں یہی تو پتا نہیں تھا۔" وہ بڑبڑائی، وہ ایکدم سے مسکرادیا تھا تبھی اماں بی آگئیں۔ ان کے پیچھے نوردین باکس لیے آگیا۔

"زیادہ تکلیف تو نہیں ہورہی مژگان! کتنا خون نکل گیا۔"

"نہیں اماں بی! اب تو ٹھیک ہے۔" اس نے محض انہیں بہلانے کے لیے تسلی دی۔

زخم کے ارد گرد سے بال صاف کرکے ابھی وہ اسٹچنگ کرنے ہی لگا تھا کہ اماں بی ایک دم سے بول پڑیں۔

"رک جاؤ دانی! ایک منٹ، میں جارہی ہوں یہاں سے مجھ سے دیکھا نہ جائے گا۔" جھرجھرا کر وہ اپنا غرارہ سنبھالتی اندر کی سمت مڑ گئیں۔

"یہ اپنی اماں بی بھی بس۔" وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

"اور آپ کو ادھر کوئی تکلیف تو نہیں ہے مس حسن!" وہ اس سے پوچھنے لگا اور ہاتھ بڑی مہارت سے اپنے کام میں مصروف تھے۔

"نہیں سر! میں بالکل مطمئن ہوں یہاں پر۔" وہ شکر گزاری سے مسکرائی۔

دانیال نے دیکھا۔ واقعی ایک سکون سا اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

"ہاں سارا کام اپنی مرضی سے جو کرنا ہے۔ کوئی ڈانٹنے والا جو نہیں۔"

"تو سر! اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو آپ ڈانٹ لیں۔"

"نہیں مس حسن! مجھے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ آپ یقین کریں گی۔ میں نے اماں بی کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا جتنا وہ آج کل رہتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے میں انجانے میں کوئی نیکی کرگیا ہوں ان کے ساتھ۔"

وہ بھی مسکرانے لگا۔ وہ چند لمحے پہلے کی تلخی بھول کر سادگی سے مسکرادی۔

"نہیں انجانے میں تو آپ نے ان کے ساتھ نہیں بلکہ میرے ساتھ نیکی کی ہے۔" اس کی آنکھیں ایک دم ہی سے جھلملا گئی تھیں۔

اسے تحفظ چاہیے تھا اور یہاں سے اسے تحفظ کے

ساتھ ساتھ محبت و اپنائیت بھی مل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عجیب سے احساس کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تھی۔

کوئی رو رہا تھا اس کے قریب ہی سے آواز آئی تھی گھڑی پر نظر پڑی ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"اماں بی!" وہ کرنٹ کھا کر اٹھی تھی۔ اپنے بستر پر بیٹھی کوئی تصویر تھامے وہ روئے جارہی تھیں۔

"اماں بی! کیا ہوا؟" دھیرے سے ان پر جھک کر انہیں پکارا اور دوسرے ہی لمحہ جیسے اس کا رنگ اڑ گیا تھا ان کے ہاتھوں میں ایک تصویر دیکھ کر۔

"یہ..... یہ۔" خوابیدہ آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں۔ "کون سی حقیقت کا انکشاف ہونے جارہا تھا۔ اس کا دل جیسے بہت زور سے دھڑک کر ایک دم سے بیٹھ گیا تھا۔

"میری..... میری بیٹی ہے یہ۔" آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر تصویر پر گر رہے تھے۔

"یہی تو ہے میری زونی، جس کا میں ہر روز انتظار کرتی ہوں۔" وہ روتے روتے کہہ رہی تھیں۔

"آپ کی بیٹی۔" وہ جیسے کھلے آسمان کے نیچے آندھیوں کی زد میں آگئی تھی۔

اس نے بے یقینی سے ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔

وہ مما تھیں۔ بے تحاشا ہنستی ہوئی، ویسی ہی تھیں اور ویسے ہی ہنستے ہوئے گالوں میں پڑتا گڑھا۔ بس ایک فرق تھا کہ یہ تصویر ہنستی ہوئی تھی جبکہ اس نے مما کو کبھی بھی کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر اس کی نگاہیں دھوکہ نہیں کھاسکتی تھیں۔

"زونی۔ زونیرہ۔" اماں بی پھر سسک اٹھیں۔

"زونی۔ زونیرہ۔" اس کے ہاتھ پیروں سے گویا اس کی پوری جان نکل گئی اب تو کوئی بھی شک نہیں رہا تھا۔ وہ اس کی ماں ہی تھیں زونیرہ احمد حسن، وہ تصویر کو ساکت نظروں سے دیکھتی وہیں بستر پر بیٹھتی چلی گئی۔

اس کا سارا وجود گویا زلزلوں کی زد میں تھا۔ اماں بی بھی اب ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ وہ انہیں چپ کرائے یا خود بھی ان کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اماں بی کو روتے دیکھ کر ماؤف ذہن کے ساتھ سوچا۔

"ایک غلط فیصلے کی نظر ہوگئی میری بچی۔ کہا تھا شیخ صاحب سے ایک دفعہ خود سے تو پوچھ کر دیکھیے اس سے کیا ہوا تھا کہنے لگے اگر لحاظ و مروّت کا پردہ بھی چاک ہوگیا تو جیتے جی میں تو مروں گا ہی اسے بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اب بھی تو مر گئے ہیں جیتے جی ہم بھی اور ہماری بیٹی بھی۔ ایک بار تو بھروسا کرکے دیکھتے اس پر۔ اتنے لاڈوں سے پالا تھا اسے پھر لوں نظریں پھیر لیں جیسے کہیں سے اٹھا کر لائے ہوں۔"

وہ روئے جارہی تھیں اور بولے جارہی تھیں وہ تو بس ساکت بیٹھی ان کے ہلتے ہوئے لب دیکھ رہی تھی۔

"ایک تنکا بھی لے کر نہ گئی تھی اس گھر سے میری بچی، جو زیور میں نے اسے رخصتی پر دیا تھا وہ بھی جاتے جاتے اتار گئی، ہمارے منہ پر مار گئی، ہم نے اسے ایسے رخصت کیا تھا جیسے کوئی مرے ہوئے کو رخصت کرتا ہے ہمیشہ کے لیے۔ جب اس کے ابا میاں نے کہا اب تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے اس گھر کے دروازے اب ہمیشہ کے لیے تم پر بند ہیں تب اس نے کہا تھا۔

"جب دل کے دروازے ہی بند ہوجائیں تو گھر کے دروازے کھلے ہوں یا بند، کیا فرق پڑتا ہے۔"

ہاں کیا فرق پڑتا تو ہی دل کا دروازہ کھول لیتی بچی! ماں باپ سدا تھوڑی ناراض رہتے ہیں۔ ہم نے اس دن سے لے کر آج تک تیرا انتظار کیا ہے تیرے ابا میاں کیسا روئے تھے تیری دہلیز پار کرتے ہی، تو جو پلٹ کر ایک بار دیکھ لیتی تو پھر نہ جاتی۔ کبھی تو آتی، آتی تو سہی، وہ ایک بار پھر زور زور سے رونے لگیں۔ کیا کیا تھا اس کی ماں نے۔" وہ چکراتے سر کے ساتھ انہیں

ویسے ہی روتا چھوڑ کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

اسے سوتے ہوئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس کا پرسنل سیل بڑے زوردار انداز میں چیخ اٹھا اور اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

آنکھ کھولتے ہی نظر سیدھی گھڑی پر پڑی تھی پونے دو بج رہے تھے۔ اس نے بیزاری سے موبائل ہاتھ میں لیا اور اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کی نیند گویا ہوا ہو گئی۔

"ہیلو...!"

"سر...." دوسری طرف کیسی روتی بلکتی آواز تھی لمحہ بھر کے لیے اعصاب تن گئے تھے اس کے۔

"مس حسن! خیریت تو ہے؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"سر! کیا آپ ابھی اسی وقت یہاں آسکتے ہیں۔"

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب بھی رو رہی ہے۔

"وہاں سب خیریت تو ہے نا مس حسن!" اس کا دل دھڑکنے لگا تھا کسی انہونی کے خیال سے۔

"سب ٹھیک ہے یہاں۔ ہر کسی کو اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے' کسی کو اپنے گناہوں کی اور کسی کو ناکردہ گناہوں کی۔ مجھے کس بات کی سزا ملی میں نے کیا کیا ہے جو خدا نے مجھے آزمایا۔ میری سزا کب ختم ہوگی۔ اللہ کو مجھ پر کب ترس آئے گا۔" وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ایک لمحہ کو تو وہ چکرا سا گیا۔

بے ربط الفاظ' اور اس سے بھی عجیب لہجہ' تڑپتا ہوا' شکایتیں کرتا۔

"وہ آخر کس تکلیف میں ہے۔" اس کے دل کو جیسے کچھ ہوا۔

ابھی تین دن پہلے جب وہ وہاں گیا تھا تب تک تو وہ انتہائی مطمئن اور پرسکون تھی۔

"ہوا کیا ہے مس حسن! آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔ عجیب سی بے قراری نے اسے لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"آپ بس آجائیں۔ ابھی اسی وقت۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اچھا' میں آرہا ہوں۔" مزید کچھ اور پوچھے بغیر اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اسے فون کر کے وہ وہیں لاؤنج میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کے پاپا نے اسے بتایا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان سے آئے تھے ہجرت کر کے اور ان کے ماں باپ، بہن بھائی وہیں ختم ہو گئے تھے اس نے ہمیشہ یہی سوچا کہ اس کی مما کے ساتھ بھی یہی ہوا ہوگا۔ نہ کبھی اس نے ان سے پوچھا نہ کبھی انہوں نے اسے بتانے کی کوشش کی۔

اس کے سارے اپنے زندہ تھے اور وہ کیسے تنہا زمانے کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ کیا یہی لوگ اس کی تباہی کے ذمہ دار تھے۔

کون سی کہانی تھی جو ان پچیس سالوں پر محیط تھی اور اس میں اس کی ماں کا کیا کردار تھا؟ کیا کیا تھا اس کی ماں نے کہ ان سب لوگوں نے اس سے یوں منہ موڑ لیا تھا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔

اتنے اچھے لوگ' اماں بی اور ابا میاں جیسے بے ریا اور سادہ' محبتوں سے گندھے بے ضرر سے لوگ۔

کیا اس کی ماں کوئی بری عورت تھی مگر اس کے لیے تو سب سے اچھی ماں تھی' اس نے روتے ہوئے ایک لمحے کو سوچا۔

اس نے اکثر انہیں روتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر پاپا کو انہیں سمجھاتے ہوئے بھی۔ "میں جانتا ہوں جو کچھ ہوا اسے بھولنا بہت مشکل ہے جو کچھ آپ سے چھینا جا چکا ہے وہ واپس ملنے کی امید رکھنا بے کار ہے بس خدا ہی تو ہے جس سے بندہ امیدیں باندھ لیتا ہے خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کو صبر دے۔" وہ دھیرے دھیرے انہیں سمجھاتے تھے۔

"آپ میں بہت صبر ہے میرے اندر اتنا حوصلہ کیوں نہیں ہے۔ آپ سے بھی تو بہت کچھ چھین لیا ہے۔" وہ زور زور سے رونے لگتیں۔

"آپ کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں زونیرہ!" وہ افسردہ سے ہو جاتے۔

"سب کچھ تو آپ نے کھویا ہے۔ میرا جس سے ساتھ چھوٹا وہ کوئی خوشگوار یاد نہیں ہے' آپ نے تو اپنے پورے گھر کے ساتھ ساتھ اپنے دل سے بھی رشتہ توڑا تھا۔"

وہ آہستگی سے اپنے آنسو پونچھ لیتیں۔

وہ سب کچھ چھوڑتے وقت صرف آپ سے ہی رشتہ جوڑا تھا' دل کا بھی اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا کیا ہوا۔ جو وہاں تھا پھر وہیں رہ گیا اسے بس یاد کیا تو بری یاد سمجھ کے۔"

پاپا کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو جاتی تھیں۔ اس کے لیے یہی بہت تھا۔ وہ کیا باتیں کرتے تھے' پاپا انہیں کیا سمجھاتے تھے' اس نے کبھی بھی کانوں میں پڑنے والے ان الفاظ کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش نہ کی تھی اس کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ پاپا اس کی روتی ہوئی مما کو خاموش کرا دیتے تھے۔

ان لفظوں کے پیچھے جو کہانی تھی وہ آج کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اماں بی اسے دیکھ کر کیوں [illegible] تھیں یہ سبب آج ہی اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

اس کی آنکھیں اور گالوں میں پڑتا گڑھا بالکل مما جیسا تھا۔

ابا میاں کیوں اس کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ انہیں اس میں اپنی بیٹی نظر آتی تھی۔

اس کی نظر لان سے ہوتے ہوئے سیدھی گیٹ پر ٹھہر گئی تھی۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں سے گزر کر اس کی ماں گئی تو پھر کبھی نہیں لوٹی' وہ اب لوٹ کر آبھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

کیسی اچھی سزا دی تھی اس کی مما نے ان لوگوں کو۔ [illegible] گئیں مگر پلٹ کر نہیں آئیں ان کا انتظار' انتظار [illegible] گیا۔" وہ دھیرے سے اٹھ کر کھڑکی میں آکھڑی [illegible] کی ٹھنڈی اور بھیگی بھیگی سی ہوا بھی اس کی [illegible] کو کم نہ کر سکی تھی اس نے سیاہ آسمان پر نظر [illegible]

کوئی تارہ نہ تھا پورے آسمان پر' آسمان سیاہ تھا' شاید اس کے نصیب کی طرح۔ اس نے سیاہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

پتا نہیں لوگ ایسے انکشاف پر کیسا ردعمل ظاہر کرتے ہوں گے۔ اس پر سے تو گویا پوری ٹرین گزر گئی تھی۔ وجود کے پرخچے سے اڑ گئے تھے۔

کتنی ہی دیر تک وہ وقت کا احساس کیے بغیر وہیں کھڑی رہی۔

"کیا ہوا بیٹا! نیند نہیں آرہی۔" اس نے پلٹ کر دیکھا۔

ابا میاں دروازے پر کھڑے تھے شاید تہجد پڑھنے اٹھے تھے عادت کے مطابق۔

وہ کچھ بھی بولے بنا تھکے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا مژگان؟" متورم آنکھیں چونکا گئیں۔

"آپ کو پتا ہے میں کون ہوں؟" سپاٹ چہرہ' سپاٹ آنکھیں اور اس پر اتنا ہی عجیب و غریب سوال۔

ان کا دل بے اختیار ہی دھڑکا تھا۔

"کیا تم وہی ہو جو میں نے تمہیں سمجھ لیا ہے پہلے دن ہی سے؟" انہوں نے پھر اسے دیکھا تھا' وہ اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈالے کھڑی تھی۔

"میں زونیرہ احمد حسن کی بیٹی ہوں۔" اس کی آواز آئی تھی ان کے کانوں میں وہ ساکت کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

جانے کیوں یہ سب سن کر وہ حیران نہیں ہوئے تھے جیسے یہ سب یوں ہی ہونا تھا۔

"زونی.... میری زونیرہ۔" ان کے لب آہستگی سے کپکپائے۔

پچیس سال بعد ان در و دیوار نے ان کے منہ سے یہ نام دوبارہ باآواز بلند سنا تھا۔

ہاں' وہ تو انہیں پہلے دن ہی سے اپنی اپنی لگی تھی۔ اس کی آنکھیں بار بار انہیں چونکاتی تھیں' اس کی عادتیں حیران کرتی تھیں۔

وہ ہمیشہ الٹے ہاتھ سے ہر کام کرتی تھی زونی کی طرح'

سوائے کھانا کھانے کے اِس نے ہر وہ کتاب ان کی لائبریری سے بڑے شوق سے اٹھائی جسے ان کی اپنی بیٹی نے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔

اور اس دن تو وہ ڈر سے گئے تھے جب انہوں نے اسے عشق پیچاں کے سائے تلے کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنے سارے پھول اس کے اوپر گر رہے تھے کچھ بالوں میں اٹک رہے تھے کچھ اس کی گود میں گر رہے تھے مگر وہ ان سب چیزوں سے بے خبر کتاب میں مگن تھی۔ اس وقت وہ انہیں بالکل زونی ہی لگی تھی۔ تب ہی بے اختیار انہوں نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی تھی اور اس کے بے اختیاری میں کہے گئے الفاظ۔

"ابا میاں پلیز، تھوڑی سی رہ گئی۔" انہیں پتھر بنا گئے تھے۔

وہ زونی نہیں تھی مگر پھر انہیں اپنی لاڈلی بیٹی جیسی کیوں لگتی تھی۔ عادت واطوار کی اتنی زیادہ مشابہت انہیں اکثر ہی چونکانے لگی تھی۔ مگر ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کی ماں بھی اس کے باپ کی طرح مشرقی پاکستان سے آئی ہوگی۔ ہوگا یہ ایک اتفاق، ہوتی ہیں بہت سے لوگوں کی عادتیں ایک جیسی، اس کی بھی عادتیں ان کی بچھڑی ہوئی بیٹی سے ملتی ہیں مگر آج کا انکشاف انہیں جیسے گرتی ہوئی دیوار کی طرح ڈھا گیا تھا۔

سارا انتظار بے کار گیا۔ وہ تو کب کی مرگئی، یہاں یہ سب انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

"میری زونی، مرگئی۔" ان کے بوڑھے لب تھرتھرائے تھے اور وہ قریبی کرسی پر گرتے چلے گئے۔

"کاش یہ انتظار کبھی ختم نہ ہوتا۔" وہ ایک دم ہی سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

"بھول گئے آپ۔ آپ نے انہیں پچیس سال پہلے ہی مار دیا تھا۔ آپ نے انہیں مار دیا، کیا کیا تھا میری ماں نے جو آپ نے اس گھر کے دروازے ان پر ایسے بند کیے کہ وہ زندوں کو ترستی رہیں اور ترس ترس کر مر گئیں۔ مجھے بھی انہوں نے کبھی کچھ نہیں بتایا میں نے ہمیشہ یہی سمجھا جس طرح پاپا ایسٹ پاکستان سے اپنا سب کچھ لٹا کر آئے تھے وہ بھی اس طرح لیکن، لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ ان کے اپنوں نے انہیں جیتے جی مار دیا تھا خود اپنے گھر کے دروازے ان پر بند ہو گئے۔

کیوں؟ ایسا کیا قصور کیا تھا میری ماں نے؟ میں نے ہمیشہ انہیں روتے ہوئے ہی دیکھا' پاپا نہ ہوتے تو شاید وہ ساری زندگی روتی ہی رہتیں اور انہیں کوئی چپ کرانے والا ہی نہ ہوتا۔ میں نے انہیں کبھی کسی کا برا چاہتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انہوں نے آپ لوگوں کا دل دکھایا ہوگا مجھے یقین نہیں آتا میری ماں جو گھونسلے سے گرے چڑیا کے بچے کے لیے اپنے آنسو بہا سکتی ہے وہ کسی کے ساتھ برا کیسے کر سکتی ہے۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تمہاری ماں دنیا کی سب سے اچھی عورت تھی۔ اچھا ہوا جو مرگئی۔ میں اس سے کیسے نظریں ملا پاتا۔ اچھی سزا دی تو نے ہمیں بیٹی۔ ہمیں معاف کیے بغیر چلی گئی۔ ہم ڈھونڈتے ہی رہ گئے تجھے ___ اللہ کو منظور جو نہ تھا کہ اس دنیا ہی میں معافی مل جاتی۔ سب نے اس گھر کو اکیلا کر دیا۔ سب چلے گئے ایک ایک کر کے مگر ہمیں تو تیرا انتظار تھا کہ تو آئے گی ضرور اپنے ابا میاں کے پاس، اپنی اماں بی کے پاس تو تو سچ مچ روٹھ گئی بیٹی۔" آنکھوں سے گرتے آنسو ان کی سفید داڑھی کو تر کر رہے تھے۔

اس نے بے تاثر نظروں سے انہیں روتے ہوئے دیکھا اور پلٹی۔ اماں بی دروازے کی چوکھٹ تھامے بے حس و حرکت کھڑی تھیں۔

"کیسے یقین کروں کہ میری بیٹی اب اس دنیا میں نہیں ہے، میں ہوں اور وہ نہیں ہے۔ کب گود اجڑی مجھے خبر ہی نہ ہوئی تو نے مجھے کیوں انتظار کی لذت سے بھی محروم کر دیا میرے اللہ! میری بیٹی مجھ سے ملے بغیر ہی چلی گئی تیرے پاس۔ اس نے ہمارا انتظار بھی نہ کیا ہم سے پہلے چلی گئی۔" عجیب بے بس سا لہجہ تھا ان کا۔

"اس کو تو ابھی بہت کچھ بتانا تھا۔ اس کے جانے کے دوسرے دن ہی اس کی مینا مرگئی تھی۔ بہت پیا

کرتی تھی نا وہ اس سے۔ چڑیوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ایک ایک کر کے سب مرنے لگیں' تب اس کے ابا میاں نے ایک دن سارے پنجروں کے دروازے کھول دیے۔ جانے کہاں چلی گئیں سب کی سب زونی کی طرح' پھر لوٹ کر ہی نہیں آئیں۔ اچھا ہوا وہ چلی گئی۔ بہت خفا ہوتی اگر جو اسے پتا چلتا کہ ابا میاں نے اس کے اتنی محبت سے پالے ہوئے پرندوں کو یوں آزاد کر دیا ہے۔" ان کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے اور بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ان دونوں کو روتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ دونوں بہت دیر تک روتے رہے تھے۔ پھر اماں بی نیم جان ہو کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہی نظر کھڑکی کے پاس کھڑی مژگان پر پڑی تھی۔

ان کی بیٹی کی نشانی' بالکل ویسی ہی تھی وہ مگر وہ تو نہیں تھی۔ ان کے دل میں کسک سی جاگی۔

"میرے پاس آؤ مژگان' میری بیٹی۔" وہ اسے آواز دے رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک بھی نہیں۔

"مجھ سے بھی خفا ہو بیٹی' اپنی اماں بی سے؟" ان کا لہجہ ٹوٹ گیا۔

"ہر رشتے کو ترس گئی میں آپ لوگوں کی وجہ سے۔ آپ کو پتا ہے کیسی زندگی گزاری ہے میں نے۔ سوائے ماں باپ کے کوئی رشتہ نہیں تھا میرے پاس' سب رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی۔ جب میری ماں نے کہہ دیا تھا کہ میرا کوئی نہیں تو واقعی کوئی نہیں ہے' میرا بھی کوئی رشتہ نہیں ہے جیسے وہ مر گئی تھیں' ویسے سمجھ لیں آپ لوگوں کے لیے میں بھی۔" وہ روتے ہوئے کمرے سے نکلی اور سامنے سے آتے دانیال احمد سے ٹکرا کر رک گئی۔

بکھرے بال' اترا ہوا چہرا اور بھیگی آنکھیں اسے پریشان کر گئی تھیں پھر اندر کمرے کا منظر۔

ابا میاں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے نم آنکھیں لیے بیٹھے تھے اور دوسری طرف دہلیز پر بیٹھی زور زور سے روتی اماں بی۔

وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے مس حسن؟" اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ کو پتا ہے' یہ میرے کون ہیں؟" اس کے لب دھیرے سے کپکپائے تھے۔ لہجہ شکائتی تھا۔

"کون ہیں؟" عجیب سے احساسات کے ساتھ اس نے سوال کیا۔

"یہ..." وہ سسکی تھی۔ "یہ میری مما کے..." بات ادھوری چھوڑ کر وہ بھاگتے ہوئے برآمدے کی طرف چلی گئی۔

"اماں بی! یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" ادھوری بات مکمل نہیں ہوئی تھی مگر اس کو چونکا ضرور گئی تھی۔ وہ تیزی سے اندر آیا تھا دہلیز پر بیٹھی اماں بی کے پاس۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تب وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ابا میاں کی کرسی کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"ابا میاں!" اس نے آہستگی سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"وہ زونی کی بیٹی ہے۔" جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"جی!" بڑی حیرت سے ان کی صورت دیکھی تھی اس نے' تب اماں بی اسے سب کچھ پھر سے بتانے لگیں۔

سادہ سے چہرے پر چھائی سنجیدگی و معصومیت اور کبھی کبھار آنے والی بے ساختہ سی مسکراہٹ بے اختیار ہی ذہن کے پردے پر لہرائی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی شاید دوسری بار آج اس سے ملا تھا۔ پھپھو کی بے شمار تصویریں اس نے اپنے گھر میں دیکھی تھیں۔ آج یاد آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں اور گالوں پر پڑتا گڑھا بالکل پھپھو کی طرح تھا۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے اماں بی!" ان کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرا دیا تھا۔ عجیب طرح کی سرشاری نے اس کے اندر سر اٹھایا اس کے انداز و اطوار اور رکھ رکھاؤ اسے اکثر چونکاتے تھے۔

"ہاں... مگر ہماری زونیرہ تو مر گئی۔" اماں بی سسک اٹھیں۔

"نہیں اماں بی! وہ تو آپ کی نواسی کی شکل میں

دوبارہ زندہ ہو گئی ہیں۔" انہیں تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی ہم سے ناراض ہے۔" ابا میاں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"کب تک ناراض رہے گی۔" اس کی نظر بے ساختہ ہی کھڑکی سے باہر پڑی تھی۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے گویا سارے زمانے سے ناراض بیٹھی تھی۔ ایک بہت اپنائیت بھری مسکراہٹ آئی تھی دانیال احمد کے چہرے پر۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے برآمدے میں آگیا مگر وہ اب بھی بے خبر تھی۔ "مژگان" شاید پہلی بار اس کا نام لے کر اس نے اسے پکارا تھا اور اسے اچھا بھی لگا تھا اس کا نام لینا۔ اس کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا۔

"اندر چلیں... یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟" وہ کہنے لگا۔

الجھے بکھرے بال' چہرے پر آنسوؤں کے نشان' خشک ہونٹ' سرخ بوجھل آنکھیں اور کندھے سے سرکتے دوپٹے سے بے نیاز وہ بے حس و حرکت بیٹھی جانے کس چیز پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

اس نے خاموشی سے اس کا جائزہ لیا پھر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا سیڑھیوں پر۔

"آپ خفا ہیں سب سے۔" اس نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ چپ رہی۔

"ان ماں باپ کا سوچیے مژگان! جو پورے پچیس سال تک اپنی بیٹی کو ڈھونڈتے رہے اس کا انتظار کرتے رہے اس امید پر کہ وہ کبھی تو آئے گی مگر آج ان کا انتظار ختم ہوا بھی تو کیسے۔ سوچیے ان پر کیا گزری ہوگی جب انہیں پتا چلا ہوگا جس بیٹی کا وہ دن رات انتظار کرتے رہے ہیں۔ وہ انہیں چھوڑ کر ایک ایسی جگہ چلی گئی ہے' جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا اور وہ بھی اب کبھی بھی واپس نہیں آئے گی' کتنا بے معنی اور لاحاصل انتظار تھا ان کا۔ جاکر دیکھیے اپنی اولاد کی موت کی خبر کیسے مار دیتی ہے ماں باپ کو۔"

"آپ کی شکل میں انہیں زندگی مل رہی ہے تو آپ کیوں خفا ہو گئی ہیں ان سے۔" وہ بڑے رسان سے کہنے لگا۔

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ ان کا انتظار کسی کو نہیں تھا۔" وہ چلا اٹھی۔

"آپ کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ آپ کے چچا کے علاوہ بھی کوئی رشتہ دار ہے اس دنیا میں۔"

"آپ کے اوپر اعتماد نہیں کیا گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے ماں باپ کو بھی ہم پر بھروسا نہیں ہے' جو کچھ ماضی میں ہوا' ہم سب بہن بھائیوں کو پتا ہے۔" وہ ذرا سا چڑ گیا۔

"نہیں سننا مجھے کوئی کہانی' اگر میری مما نے کوئی قصور کیا بھی تھا تو اسے معاف بھی کیا جا سکتا تھا۔" وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

"آپ کو میں کوئی کہانی سنانے بھی نہیں جا رہا۔" وہ کہنے لگا۔

"دیکھیں مژگان! وہ وقت کیسا تھا نہ میں جان سکتا ہوں نہ آپ۔ آج کی بات کیجیے۔ معاف کر دیجیے ابا میاں کو' اٹھیں چلیں ان کے پاس اماں بی بھی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" اس نے بہت اپنائیت کے ساتھ اس کے آنسو خشک کیے۔

"نہیں... مجھے اندر نہیں جانا۔" عجیب ضدی لہجہ تھا اس کا وہ بالوں پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ پہلی والی مژگان احمد حسن سے بالکل مختلف کوئی لڑکی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ "پھر کہاں جائیں گی؟" اس نے زچ آکر پوچھا۔

"اپنے گھر..." کہہ کر کھڑی ہو گئی۔

"اپنے گھر۔" اس نے حیرت سے دہرایا اس کی معلومات کے مطابق تو وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔

"جی میرا گھر ابھی ہے۔" اس کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔

"یہی ہے اب آپ کا گھر۔" اس نے پھر اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں ہے یہ میرا گھر' مما کا نہیں تھا تو میرا بھی نہیں ہے۔" وہی ہٹیلا لہجہ۔

"مژگان!" اس کا لہجہ ذرا سا تنبیہی ہو گیا۔

"آپ مجھے چھوڑ کر آئیں گے یا میں خود ہی۔"

"اسے چھوڑ آؤ اس کے گھر دانی!" ابامیاں کی آواز آئی تھی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ کب برآمدے میں آئے پتا ہی نہیں چل سکا۔

"جی ابامیاں!" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ یونہی بے حسی سے کھڑی رہی۔

"جب تک یہ وہاں رہے گی تم اس کا خیال رکھو گے اور تمہاری اماں بی ساتھ جائیں گی۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"اور سنو تم۔۔" انہوں نے انگلی سے مژگان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اپنی بیٹی میں کھو چکا ہوں۔ اب اس کی بیٹی نہیں کھو سکتا۔ تمہیں واپس لوٹنا ہے سمجھ گئیں نا تم ہمت بھی مجھے آزمالو' اب بھی بہت ہمت ہے مجھ میں۔" سخت لہجے میں بولتے بولتے آخر میں ان کی آواز بھرا گئی۔ ایک لحہ کو اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ ملامت بھری نگاہ اس پر ڈال کر ابامیاں کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

دن نکل رہا تھا جب اس نے گاڑی روکی تھی اس کے گھر کے آگے۔

"دروازہ اچھی طرح بند کر لیجیے گا۔" وہ اندر آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

سو اس کے گاڑی سے اترتے ہی اپنی طرف سے ہدایت دیتے ہوئے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے؟" بے ساختہ اس سے پوچھا اور اماں بی کی طرف دیکھا۔

"اماں بی ابھی نہیں آئیں گی' خدا حافظ۔" وہ زن سے گاڑی لے اڑا تھا وہ حق دق کھڑی رہ گئی۔

اماں بی "ارے ارے" کرتی رہ گئیں مگر وہ کان بند کیے گاڑی چلاتا رہا۔ "چھوڑ کر آ مجھے واپس وہیں دانی!"

"پنڈی چھوڑ آؤں گا مگر وہاں نہیں' بننے دیں ثار زن' دو دن میں دماغ ٹھکانے نہ آگیا تو میرا نام کچھ اور رکھ لیجیے گا۔" وہ راستے بھر بڑبڑاتا رہا۔

"اکیلی لڑکی کیسے رہے گی' چھوڑ کر آ مجھے وہیں' غصہ ہے اتر جائے گا کوئی گھر سے تو نہیں نکال دے گی نا مجھے۔"

"مجھے پتا ہے وہ چاہ رہی تھیں کہ آپ اتر جائیں مگر کیا ان کے منہ میں زبان نہیں تھی کہہ نہیں سکتی تھیں آپ سے؟"

"دیکھ تو رہی تھی نا مجھے۔"

"بڑی آنکھوں کی زبان پڑھنا آگئی ہے آپ کو اماں بی۔" وہ ایک دم ہی سے مسکرایا تھا انہیں دیکھ کر۔ خفا خفا سی آنکھوں نے جیسے دل پر دستک دی تھی' دل تو چاہا ابھی پلٹ جائے۔

"بک بک نہ کر۔ مجھے لے چل واپس' پتا نہیں کب سے بند پڑا ہو گا گھر۔۔۔ پھر اپنی بیٹی کا گھر تو دیکھ لیتی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"ابھی تو آپ اپنے بیٹے کے گھر جا رہی ہیں میں اب کل لے کر جاؤں گا آپ کو ان کے پاس جب ان کے سارے کس بل نکل چکے ہوں گے' زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نہ ان کی سنی تھی نہ اپنے دل کی۔

☆ ☆ ☆

عین عشاء کے وقت کسی نے زور زور سے دستک دی تھی۔

"کون۔۔ کون ہے۔۔۔؟" وہ شاید گیٹ کے قریب ہی تھی۔ تب ہی فوراً" آواز آئی تھی قدرے گھبرائی ہوئی۔

"کھولیں گیٹ۔ میرے علاوہ کون آئے گا یہاں پر۔" اس کی تپی ہوئی آواز پر اس نے سکون کا سانس لے کر پورا گیٹ کھول دیا تھا۔

"بیل کو کیا ہوا؟" وہ اندر آگیا' پورے گھر میں اندھیرے کا راج تھا' وہ چپ رہی۔

"کیا صرف آپ کے گھر کی لائٹ گئی ہوئی ہے؟" اس نے پھر دریافت کیا۔

"اصل میں اتنے عرصے سے گھر بند پڑا تھا تو شاید۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔ اب اسے کیا بتاتی آج اس بجلی کے چکر میں خاصا خوار ہوئی تھی۔

"اُفوہ۔۔!" ناگواری سے کہہ کر وہ موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔

"تقریباً" ایک گھنٹے بعد ہی پورا گھر جگمگا رہا تھا روشنی سے۔ وہ گھوم پھر کر ہر ہر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ پورا گھر صاف پڑا تھا غالباً" آج سارا دن اس نے یہی کام کیا تھا۔

لائٹ کے آتے ہی وہ کچن میں گھس گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چائے لے کر آئی اس کے لیے مگر اس وقت تک وہ وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا وہ اسے جگائے بغیر خاموشی سے پلٹ گئی اور کچن میں رکھے شاپرز میں سے چیزیں نکال نکال کر ڈبوں میں ڈالنے لگی جو وہ آج دوپہر کو مارکیٹ سے لے کر آئی تھی۔

"آپ کے ہاں چائے پلانے کا رواج ہے یا نہیں؟" اچھی خاصی ناراض آواز تھی اس کی۔

اس نے مڑ کر دیکھا وہ کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"سو گئے تھے آپ' جب میں چائے لے کر آئی تو۔"

نہ جانے کیوں اس نے صفائی پیش کی۔

"سویا تھا' مر تو نہیں گیا تھا۔ جگا لیتیں۔" وہ جیسے بالکل ہی ناراض ہو گیا۔

"لاحول ولا۔" وہ ہڑبڑا کر رہ گئی۔

"کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ برداشت کر گئی کہ وہ اس وقت تقریباً" فرشتہ بن کر آیا تھا اس کے لیے۔

"آپ کھانا کھائیں گے' لگا دوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں کھا کر آ رہا ہوں۔" اس نے منع کر دیا۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" اس نے سنک میں برتن دھوتی مژگان سے پوچھا۔

"کیسا ارادہ؟" اس نے نل بند کر کے اسے دیکھا۔

"کیا آپ اکیلے رہ سکتی ہیں؟" اس کا انداز سوالیہ [illegible]

"رہ لوں گی۔"

"آپ جانتی ہیں اس دنیا میں اکیلے رہنا خصوصاً" [illegible] کے لیے کتنا مشکل ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"جانتی ہوں بہت مشکل ہے مگر میں اس سے پہلے بھی رہی ہوں۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔"

"میرے لیے اب بھی وہی بات ہے۔"

"تو ہمارے لیے تو نہیں ہے نا۔ اب آپ تنہا نہیں ہیں۔"

"آپ میری فکر مت کیجیے۔"

"پھر کون کرے گا؟"

"میرے لیے اللہ ہی کافی ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کے بعد بھی کچھ لوگ ہیں جنہیں آپ کی فکر ہے۔"

"مجھے یہیں رہنا ہے بس۔"

"اکیلے؟"

"عادت ہے مجھے اور یہی میرا گھر ہے۔"

"گھر تو ہے یہ آپ کا۔ لیکن اتنے سارے لوگ جو آپ کا انتظار کر رہے ہیں آپ کے اپنے' ان سے ناراض رہ کر آپ رہ لیں گی تنہا؟"

"میری مما بھی ان کی اپنی تھیں جنہیں انہوں نے تین کپڑوں میں نکال دیا تھا۔" وہ بولی۔

"وہ خود ہی یہ سب چھوڑ کر گئی تھیں۔"

"جب آپ محبت سے ہاتھ کھینچ لیں تو دنیا کی ہر دولت بے کار ہے۔" وہ کہنے لگی۔

"آپ بھی تو یہی کر رہی ہیں۔" وہ غور سے اسے دیکھنے لگا جو ہاتھ دھو کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔

"مجھے تو جو ملا ہے وہی میں لوٹا رہی ہوں۔"

"آپ کو تو ابھی کچھ ملا ہی نہیں اور جو مل رہا ہے اس سے آپ منہ موڑ رہی ہیں۔ آپ تو خوش نصیب ہیں جنہیں اتنے سال بعد پورا کا پورا خاندان مل گیا' وہ لوگ جن سے آپ کی مما کو بے حد محبت تھی وہی لوگ پھر سے مل گئے آپ کو' پھر آپ یہ سب کیوں ٹھکرا رہی ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ ابامیاں آپ کے پیروں پر گر کے آپ سے معافی طلب کریں' تب ہی آپ انہیں معاف کریں گی۔" اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں چاہا۔" ایک دم ہی سے با

وقار سے ابامیاں اس کی نگاہوں کے سامنے آگئے۔
"پھر آپ چاہتی کیا ہیں؟" اب وہ زچ سا ہو کر پوچھ رہا تھا۔
"بس میں وہاں دوبارہ واپس جانا نہیں چاہتی۔" اس کی آواز میں بیزاری محسوس کر کے دانیال احمد کو شدید غصہ آیا۔
"ہاں آپ تو ان بوڑھے بے بس لوگوں کی تڑپ کا تماشا دیکھنا چاہتی ہیں انہیں ویسا ہی دکھ دینا چاہتی ہیں جیسا کہ نادانستگی میں وہ پھپھو کو دے چکے ہیں' اپنے آپ کو اپنی مما کی جگہ رکھ کر سوچیے کیا وہ اپنے ماں باپ کے لیے ایسا سوچ سکتی تھیں۔ انہیں احساسِ جرم میں مبتلا تنہا چھوڑ سکتی تھیں۔ پچیس سال سے وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ مرے ہوؤں کو کیا مارنا مژگان بی بی! وہ تو اسی دن مر گئے تھے جب سمیعہ پھپھو نے رو رو کر اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ سوچیے تو کیا گزری ہوگی ان لوگوں پر اس دن سے لے کر آج تک سب نے انہیں ڈھونڈا مگر شاید اللہ ہی کو منظور نہ تھا کہ وہ پھر ملتیں۔ آپ نے جھوٹ کہا' پھپھو سے کسی کو محبت نہیں تھی' ان سے محبت کرنے والوں نے ان سے وفا خوب کی۔ جس دن پھپھو کی عدیل انکل سے شادی ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہارون انکل نے اس گھر میں قدم نہیں رکھا حالانکہ ابامیاں نے ہی انہیں پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ میں نے چچا صاحب اور پاپا کو بہت کم اس گھر میں دیکھا ہے۔ پاپا نے بزنس کو بہانہ بنایا اور چچا صاحب نے نوکری کا بہانہ بنا کر وہ گھر چھوڑ دیا۔ سب چلے گئے آہستہ آہستہ یہ گھر چھوڑ کر۔ پاپا نے کتنا چاہا کہ اماں بھی اور ابامیاں ان کے ساتھ رہیں لیکن وہ دونوں گھر سے نکلنے کو تیار نہ تھے کہ جانے کب پھپھو آجائیں کہیں سے اور وہ انہیں نہ ملیں۔ تب پاپا نے مجھے ان کے پاس چھوڑا تھا۔ سالوں سے ان کی آنکھیں بے خواب تھیں۔ کچی نیندیں سوتے تھے۔ ہر آہٹ پر چونک جاتے تھے کہ شاید اب ان کا انتظار تمام ہوا مگر ان کا انتظار انتظار ہی رہ گیا۔ میں نے سب دیکھا ہے مژگان! پھپھو کے لیے ان کا رونا' تڑپنا' آپ کی صورت میں اللہ نے ان کو معافی دے دی' مگر آپ ہی انہیں معاف کرنے کو تیار نہیں۔" وہ بولنے پر آیا تو پھر بولتا ہی چلا گیا۔
"آپ کو سب رشتے میسر ہیں اس لیے آپ کو لگ رہا ہے کہ میں نے غلط کیا ہے۔" اس کے رکتے ہی وہ بولی تھی۔
"اب تو آپ کے پاس بھی سب کچھ ہے' پھر کیوں یہ تنگ دلی' اللہ کی نعمتوں سے انکار۔" اس نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا تھا ناراضی سے۔
"اللہ آپ کو تنہا نہیں رکھنا چاہتا تھا تب تو اس نے ایک ذریعہ بنایا ہم سب کو ملانے کا۔ وہ آپ کو سب رشتے دینا چاہتا تھا جن کے لیے آپ ترسیں۔ چھوڑ دیجیے بلاوجہ کی ضد اور اپنے گھر چلیے۔ خدا کسی کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا اسے۔" وہ بہت طریقے سے سمجھانے لگا۔
"ہر رشتے کے لیے ترسی ہوں میں۔" وہ ایک دم سے پھوٹ کر رو دی۔
"میں نے مما کو اکثر روتے ہوئے دیکھا تھا اور پاپا کو انہیں سمجھاتے ہوئے پایا کہ لفظوں کا مفہوم آج ہی میری سمجھ میں آیا ہے اور مما کے آنسوؤں کا سبب بھی' وہ کسی ندامت یا پچھتاوے کے آنسو نہیں تھے بلکہ بے اعتباری کے غم میں بہائے گئے آنسو تھے۔ محبت نہ دیتے ابامیاں انہیں' اعتبار کی دولت دے دیتے۔ میں نے ان سے کوئی انتقام نہیں لیا ہے انہیں یوں چھوڑ کر مزید اس گھر میں وقت گزارنا میرے لیے بہت مشکل تھا جب سے انکشاف ہوا۔ اماں بی کی باتوں سے لگا میری مما کا کوئی قصور نہ تھا۔ مجھے اس رات ہر جگہ مما کے رونے بلکنے اور معافیاں مانگنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی وہ ابامیاں کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے ہوتی تھیں کبھی اماں بی کے آگے گڑگڑاتے ہوئے۔ میرے کان پھٹنے لگے تھے ان آوازوں کو سن کر۔" وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی۔
تھوڑی دیر کو وہ بالکل خاموش رہ گیا۔
"مژگان...!" اس نے سر اٹھایا۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا۔
"آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اسی گھر میں پھپھو ابامیاں اور اماں بی سے لاڈ بھی اٹھوایا کرتی تھیں۔ ایسی تو ان گنت خوشگوار یادیں اس گھر کے چپے چپے میں بکھری ہوئی ہیں۔" اس نے شاید دوسری بار اس کے آنسو صاف کیے تھے اور اسے دیکھ کر ہلکے سے مسکراتے ہوئے پلٹا۔
"آپ تو مجھے چائے بنا کر دیں گی نہیں۔ چلیے آج میں آپ کو اپنے ہاتھ کی بنی چائے پلاتا ہوں۔" اس نے کیتلی اٹھا کر کہا۔
"میں بنا دیتی ہوں۔" اس نے کیتلی اس کے ہاتھ سے لینا چاہی تھی۔
"رہنے دیں۔ آپ منہ دھو لیں جا کر' میں اب بار بار آپ کے آنسو صاف نہیں کروں گا۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے کیتلی میں پانی ڈالنے لگا۔
"مجھے نہیں پینا ہے' میری مت بنائیے گا۔" اس کے آخری جملے پر دل ہی دل میں معترض ہوتے وہ باہر نکل گئی۔
"ہر بات میں ضد اور نہیں نہیں کی تکرار۔" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔
"آئیے چائے پیتے ہیں۔" سلیقے سے چھوٹی ٹرے میں دو مگ رکھے وہ کچھ دیر بعد لاؤنج میں داخل ہوا۔
"مجھے نہیں پینا۔ میں نے آپ سے کہا تو تھا۔"
"دیکھیں' پی لیں۔ آج تک ابامیاں اور اماں بی کے علاوہ تیسری آپ ہیں جس کے لیے میں نے اتنی زحمت کی ہے۔ اماں بھی کہتی ہیں میں ان سے اچھی چائے بنا لیتا ہوں۔"
اس کی نہ نہ پر کان نہ دھرتے ہوئے مگ اس کی طرف بڑھایا تھا جو ناچار اسے تھامنا پڑا۔
چائے واقعی اچھی تھی مگر اعتراف کیے بغیر وہ خاموشی سے پی گئی تھی۔
"کل سے آپ کو چائے بنانا ہے؟"
"آپ کیا کل بھی نہیں جائیں گے؟" وہ چائے کی پیالیاں کچن میں رکھنے جا رہی تھی پلٹ کر سرسری سے لہجے میں پوچھنے لگی۔
آواز میں سکون تھا یا ناگواری وہ اندازہ نہیں کر سکا ہاں جب اس سے بولا تو اس کا لہجہ بہت پرسکون تھا۔
"جب بھی جاؤں گا' آپ کو لے کر۔"
"مجھے نہیں جانا۔" اس کا لہجہ کوشش کے باوجود کچھ مضبوط نہیں تھا۔
"تو میں بھی یہیں رہوں گا۔" وہ آرام سے کاؤچ پر پھیل گیا۔
ساری رات منٹ بھر کو بھی آنکھ نہیں لگی۔
عجیب سا خوف تھا جو اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ حالانکہ آج تو وہ موجود تھا جب نہ ہوگا تو وہ کیا کرے گی' اسے خوف سا آیا تھا سوچ کر' کوئی چھ دفعہ تو اٹھ کر لاؤنج میں جھانکا تھا۔ ہر دفعہ وہ بڑے سکون کے ساتھ سوتا نظر آیا۔
صبح حسب توقع آنکھیں سرخ اور سر بوجھل تھا۔
"آپ تو خوب سوئیں' میں تو خاصا بے آرام رہا اس کاؤچ پر' ساری رات ڈھنگ سے نیند نہیں آئی۔ چھ دفعہ تو اٹھ اٹھ کر بیٹھا تھا۔" ناشتہ کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا ایک لمحہ کو اس کی بات سن کر پھر چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر اسے دیکھا۔
چمکتی آنکھیں' فریش چہرہ' کہیں بھی نیند کی کمی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے وہ ٹھیک ٹھاک سلگی تھی۔
"کیا ہوا؟" سلائس پر مکھن پھیلاتے ہوئے اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر اس نے مسکراہٹ روکی تھی۔
"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" سرخ بوجھل آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ اسے چونکا گیا تھا۔
"ٹھیک ہوں۔" دکھتے سر کو ہاتھوں سے تھاما تھا۔
اس نے دیکھا مگر چپ رہا۔
"اچھا پھر میں اب چلوں گا۔ ابھی گھر جا کر کلینک جانے کی تیاری کرنا ہے۔ آج شاید نہ آسکوں میں۔ عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے ابامیاں نے مجھے' اب نوکری کروں میں یا آپ کی چاکری۔ حالانکہ انہیں پتا

ہے کہ آپ تنہا زیادہ خوش رہتی ہیں۔ چلیں مزا کیجیے گا سارا دن۔ پھر رات بھی آپ کی اپنی ہے۔ میں تو آج سکون سے اپنے گھر میں سوؤں گا اپنے بستر پر۔ آپ خود تو ساری رات مزے سے سوتی رہیں اور میں۔"

"چھ دفعہ میں اٹھی تھی آپ نہیں۔" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ "آپ تو شاید مُردوں سے شرطیں باندھ کر سوئے تھے۔" اس کی بات کاٹ کر دانت پیستے ہوئے وہ کہہ اٹھی۔

"اب میرا تھوڑا بہت سونا بھی آپ کو برا لگ گیا۔" وہ گویا برا مان کر کھڑا ہو گیا۔

"ساری رات نہیں سو پائی میں۔" اپنی بے بسی پر ایک دم ہی اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"کسی اور کو بھی کہاں سونے دیا آپ نے۔" بھیگی آنکھیں دیکھ کر دل ڈولا تھا۔

"اچھا!" اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ بے یقینی بھی تھی جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔

"آپ کے خیال میں، میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" اس کی بات سن کر اور حیرت سے کھلے منہ کو دیکھ کر اس کا بی پی بڑھنے لگا۔

"چلیں اب سو جائیے گا جی بھر کے، بس ذرا گیٹ اچھی طرح بند کر لیجیے گا کل ہی تو آپ کے برابر والوں کے برابر والوں کے ہاں دن دھاڑے ڈاکہ پڑ گیا ظاہر ہے دو خواتین کو قابو میں کرنا کیا مشکل ہے۔" بے نیازی سے کہتا وہ اپنا والٹ اور موبائل جیب میں ڈالنے لگا۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"ساری معلومات لے کر آیا تھا میں کل یہاں۔" اس کی آنکھوں میں لکھی بے یقینی کی تحریر پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ چپ رہی اور دہلتی رہی۔ گھر سے نکلتے وقت یہ سب باتیں تو اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں۔

"آج کل شاید یہ سب زیادہ ہونے لگا ہے۔" اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔

"اچھا۔۔۔ میں چلوں۔" کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے آپ کو ڈر تو نہیں لگے گا؟" جانچتی ہوئی نگاہیں تھیں۔

"نن۔۔۔ نہیں۔" جسم و جان کے چیخ چیخ کر ہاں کہنے کے باوجود جواب دانیال احمد کی توقع کے عین مطابق تھا۔

وہ گہرا سانس لے کر مڑا۔

"نہیں نا، پتا تھا مجھے آپ بہادر ہیں۔ تنہا رہتی رہی ہیں؟" بغور اس کا فق چہرہ دیکھا تھا اور بڑی متانت سے مسکرایا بھی۔

"اچھا میں چلوں۔" وہ دروازے کی طرف مڑ گیا۔

"سنیں۔" وہ تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

"جی کہیے۔" وہ مڑا نہیں، ٹھہر ضرور گیا تھا۔

"اماں بی کو یہاں چھوڑ دیں، میرے پاس۔" وہ کہتے ہوئے اٹکی۔

"کیوں؟" مڑ کر بغور اسے دیکھا۔ چہرے پر کچھ شرمندگی اور خوف تھا۔

"میں اکیلی کیسے؟" وہ بولتے ہوئے ذرا سا لڑکھڑائی۔

"آپ تو عادی ہیں۔" جملہ پلٹایا، وہ پی گئی۔

"ابا میاں نے کہا تھا آپ سے۔" کمزور لہجے میں کہا۔

"ابا میاں نے تو اور بھی کچھ کہا تھا آپ سے۔ بس ا[illegible] مطلب کی بات یاد رہ گئی۔" اچھا خاصا بگڑ کر وہ بولا۔

"کیوں ان کو تکلیف دے رہی ہیں، وہ کیسے آپ کی ڈھال بن سکیں گی۔" وہ یوں بولا گویا آنے والی رات اس کے ہاں ڈاکہ پڑنے والا ہو۔ اس نے دہل کر اسے دیکھا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں رات کو اکیلی کیسے رہوں گی۔ آپ بھی نہیں۔۔۔" بے چارگی سے بھرپور لہجہ تھا۔

"ہاں، میں روز روز تو نہیں آسکتا۔" صاف جواب دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔

"گیٹ بند کر لیں۔" اپنے پیچھے قدموں کی چاپ پا کر وہ پلٹا۔

وہ وہیں فرش پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔" سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔

"اب کیا ہوا؟" گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"مجھے اماں بی کے پاس جانا ہے۔" سر اٹھا کر اس سے بولی۔

کیا حیات افزا جملہ تھا، وہ ایکدم ہی شانت ہو گیا۔

"آپ کو ٹمپریچر تو نہیں ہو گیا۔" خوشگوار حیرتوں میں گھر کر بظاہر بڑی سنجیدگی سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ کو لے کر جانا ہے یا نہیں؟" اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔

"دو راتوں کی نیندیں یونہی تھوڑی برباد کی ہیں۔" وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔

"اگر آپ زبردستی جا رہی ہیں، کسی ڈر و خوف کی وجہ سے تو خود کو مجبور نہ کریں۔ زبردستی تو کسی سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ میں انہیں چھوڑ جاتا ہوں، آپ کے پاس۔" وہ ایکدم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا، اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے پتا ہے وہ مجھے تنہا رہنے نہیں دیں گی۔ آپ جائیں گے تو وہ فوراً" آبھی جائیں گی لیکن میں خود جانا چاہتی ہوں ان کے پاس۔"

"اب کیوں جا رہی ہیں ان کے پاس۔ ضد توڑ رہی ہیں اپنی؟" وہ پوچھنے لگا۔

"ضدیں تو ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ کل سے آپ مجھ سے سر پھوڑ رہے تھے، اب میں سمجھ گئی ہوں تو آپ۔۔۔"

"نہیں، میں صرف سر نہیں پھوڑ رہا تھا آپ سے بلکہ مجھے یقین تھا آپ مان جائیں گی۔" وہ اب کے ہلکا پھلکا ہو کر مسکرا دیا۔

"شاید میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔" اس نے آہستہ سے اعتراف کیا۔

"انہوں نے مجھ سے جتنی محبت کی ہے، میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ جب انہیں کچھ پتا بھی نہیں تھا، وہ تو تب بھی مجھ سے اتنی محبت کرتی تھیں تو اب کتنی کریں گی۔ مجھے لگتا ہے، بس وہی ہیں جو مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔"

"ارے نہیں، آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔" بڑی بے ساختگی میں تیزی سے اس کے خیال کی نفی کرتا وہ اسے اچھا خاصا حیران کر گیا۔

❊ ❊ ❊

اس کے ملن کا منظر سب کی آنکھوں میں آنسو بھر گیا تھا۔

اماں بی پر تو اسے دیکھ کر گویا شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے چومتے، پیار کرتے نہ تھک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بالکل زونیرہ جیسی ہیں۔ میں تو پہلی دفعہ ہی چونکی تھی۔

بڑے ماموں آتے جاتے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے، بھیگی بھیگی آنکھیں لیے۔ چھوٹے ماموں بھی مامی سمیت آ گئے تھے لاہور۔ احمد نہیں آسکا تھا۔ اس کی نئی نئی جاب تھی۔

"بالکل تمہارے جتنی تھی زونی! جب ہم نے اسے اپنے گھر سے دور کر دیا تھا۔" اسے اپنے گلے سے لگا کر وہ خوب روئے تھے۔

"یہ مجھ سے چھوٹی ہیں کہ بڑی؟" دانیال سے چھوٹا نبیل پوچھنے لگا۔ وہ وہیں تھی، فریا کے ساتھ۔ بڑی مامی بھی اماں بی کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔

"پورے ڈیڑھ برس بڑی ہے تجھ سے، آپا کہے گا تو اسے۔" اماں بی کہنے لگیں۔

"میں ہی کیوں چھوٹا ہوں ان سے، ہر حسین لڑکی مجھ ہی سے بڑی کیوں ہوتی ہے۔ یہ دانیال بھائی سے بھی بڑی ہو سکتی تھیں یا مجھ سے چھوٹی ہو جاتیں۔ آخر میں ہی کیوں۔۔۔" اس کے واویلے پر ردا بھابھی ادھر متوجہ ہوئیں۔

"اب اللہ کے کاموں میں بندوں کا کیا دخل۔" اماں بی نے غصے میں اسے گھورا تھا۔

"نہیں، نہیں۔ اسے تم سے نہیں، دانیال ہی سے چھوٹا ہونا چاہیے تھا۔" بڑا شرارت بھرا لہجہ تھا ردا بھابھی کا۔ مژگان نے گھبرا کر اماں بی کو دیکھا۔ وہ ابھی

تک نبیل ہی کو گھورے جا رہی تھیں۔ غالباً" ان کا جملہ کانوں میں پڑا نہیں تھا۔

مامی مسکرا دیں ان کی بات سن کر' مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔ نبیل کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں جو ابھی تک منہ بسورے بیٹھا تھا۔

"بہن ہے تمہاری' فریا کی طرح۔" کہتے ہوئے وہ دوبارہ مسکرا دیں۔ ردا بھابھی کی بات نے سوچوں کے نئے در کھولے تھے ان پر۔

"بہن ہی نہیں' بڑی بہن بلکہ آپا۔" فریا نے گرہ لگائی تھی۔

"اماں بی! یہ صرف میری ہی بہن ہیں نا؟" نجانے کون سی تصدیق کروانا چاہ رہا تھا اب وہ اماں بی سے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کی بے تکی بات پر انہوں نے پھر گھورا اسے۔

"مطلب ان کی تو نہیں ہیں نا' جنہوں نے انہیں دریافت کیا ہے۔" دور بیٹھے دانیال کی طرف اشارہ کیا جو چچا صاحب کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔

گو کہ آواز کو خاصا دبا کر پوچھا تھا مگر دھمو کا اماں بی نے کھل کر لگایا تھا۔ وہ تڑپ کر ہٹ گیا تھا ان کے پاس سے۔

"ہر وقت کی بک بک۔"

"مت کہا کریں کہ اب جان نہیں رہی مجھ میں۔ اب تک جلن ہو رہی ہے پیٹھ پر۔

"گردن بھی مروڑ سکتی ہوں تمہاری' خبردار جو آگے ایک بے تکا لفظ بھی زبان سے پھسلا تو۔ جا اپنے ابا میاں کو فون کر۔"

"نہیں اماں بی! میں خود جاؤں گی ان کے پاس۔" ندامتوں میں گھر کر وہ ان سے بولی تھی۔

"ثوبیہ! یہ ردا کیا کہہ رہی تھی؟" رات سونے سے پہلے انہوں نے بڑی بہو کو بلایا تھا۔

"اچھا آپ نے سن لیا تھا اماں بی!" وہ ہنس دیں۔

"تو اور کیا بہری ہو گئی ہوں اب میں۔" وہ چڑ گئیں۔

"پھر کیا خیال ہے؟" وہ مسکرائیں۔

"جو تم کہو۔" وہ بھی مسکرا دی تھیں۔

"فریا کی شادی سے نمٹ لیں پھر تمہارے ابا میاں سے بات کروں گی۔"

❄ ❄ ❄

آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے وہ رک گئے تھے۔ ایک مانوس سی خوشبو' عجیب سا احساس۔

"زونی۔۔۔" انہوں نے جلدی سے آنکھیں کھولی تھیں۔

"ابا میاں۔۔۔" سامنے ہی تو وہ کھڑی تھی' نادم نادم سی۔

"میری بیٹی آ گئی۔" وہ بھیگی آنکھیں لیے بہت خوشگوار انداز میں مسکرائے۔

"سوری ابا میاں!" کارپٹ پر بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

"پاگل نہ ہو تو۔ ماں باپ کیا سدا ناراض رہتے ہیں اپنی اولاد سے۔ تو نے تو پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔" اس کے گھنے گھنے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرا تھا۔

"ابا میاں۔۔۔"

"میری تو آنکھیں پتھرا گئیں تیرا انتظار کرتے کرتے۔ روز لگتا تھا تو آ جائے گی اپنے ابا میاں کے پاس۔ ضروری تو نہیں آدمی کو جب موت آئے' تب ہی وہ مرے۔ کبھی کبھی بے موت بھی مر جاتا ہے انسان۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"ابا میاں۔۔۔"

"تمہاری بیٹی نے ایک دن مجھے خوب رلایا تھا۔ حالانکہ جب تو مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے' تب بھی وہ ہر وقت جیسے میرے دل کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتی تھی۔ اس کی عادتیں مجھے حیران کرتی تھیں۔ اس دن کتاب پڑھتے ہوئے مجھے وہ بالکل تم جیسی لگی تھی اور میں نے بے ساختہ ہی کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی تھی پھر اس کے الفاظ مجھے پچیس سال پہلے کی طرف کھینچ کر لے گئے تھے۔ اس دن میں ہمیشہ سے زیادہ رویا تھا تمہیں یاد کر کے۔"

"ابا میاں! بس کریں۔"

"وہ بھی مجھ سے ناراض ہے جیسے بہت سال پہلے تم خفا ہو گئی تھیں مجھ سے۔ وہ کہتی ہے' میں نے تمہیں پچیس سال پہلے ہی مار دیا تھا۔ اسے کیا پتا تمہارے ساتھ میں بھی تو مر گیا تھا اسی دن ہی۔ اب تو جب تم کہو گی کہ ابا میاں میں نے آپ کو معاف کیا' تب چین آئے گا تمہارے ابا میاں کو۔ شاید میں پھر سے زندہ بھی ہو جاؤں اس وقت۔ تم مجھے معاف کر دو گی نا اپنے ابا میاں کو۔"

انہوں نے اس کا سر اٹھایا تھا اوپر' پھر گہرا سانس لے کر کتنی ہی دیر تک ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیے اسے دیکھتے رہے۔

"تم زونیرہ نہیں ہو مگر اس کے دل کا ٹکڑا تو ہو۔" اس کی آنکھیں چوم کر وہ بے قراری سے رو دیے۔

"ابا میاں! مجھے معاف کر دیں۔" ان کے گلے سے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

❄ ❄ ❄

اس کی مما کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔

سمیعہ آپا اور ہارون احمد بڑے ابا کے بھائی کے بیٹے جو ایک حادثے میں ختم ہو گئے تھے اور ان دونوں کو اماں بی اور ابا میاں نے ہی پالا تھا' ان کے بچپن ہی [illegible] ابا میاں کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی جب سمیعہ آپا کی شادی ہوئی تو اس وقت نواز کے دو بیٹے تھے' روحیل اور دانیال جبکہ ابا میاں کے دوسرے بیٹے افراز کی منگنی ان کی کلاس فیلو سے ہوئی تھی جو دوران تعلیم ہی انہیں اچھی لگی تھیں۔ حالانکہ ابا میاں چاہتے تھے کہ ان کی شادی سمیعہ آپا سے ہو مگر افراز نے انکار کر دیا تھا۔ تب ابا میاں نے ان کی شادی عدیل احمد حسن سے کر دی جو ان ہی کے آفس میں بڑی اچھی پوسٹ پر تھے اور [illegible] پاکستان سے لٹ لٹا کر آئے تھے۔

"میں اس گھر سے دور نہیں جانا چاہتی۔" اپنی شادی پر سمیعہ آپا نے بڑا شور مچایا تھا۔ ابا میاں [illegible] تو نہ تھے' خوب سمجھ رہے تھے مگر مجبور تھے۔ جوان اولاد پر زبردستی نہیں کر سکتے تھے۔ بظاہر سمیعہ آپا میں کوئی خرابی نہ تھی مگر جب افراز ہی کی دلچسپی ان میں نہیں تھی تو یہ سب فضول تھا۔ وہ بے چارے کرتے بھی تو کیا۔

اس وقت زونیرہ عرف زونی ابا میاں کی اکلوتی بیٹی جو دونوں بھائیوں نواز اور افراز سے چھوٹی تھی' ماسٹرز کر رہی تھی۔ ہارون احمد اور وہ ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتے تھے۔ ہارون احمد نے سمیعہ آپا کی شادی کے فوراً" بعد نیا نیا بزنس اسٹارٹ کیا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتے تھے تاکہ سر اٹھا کر ابا میاں سے زونیرہ احمد کو مانگ سکیں۔ دو سال کے عرصے میں انہوں نے بہت ترقی کی تھی' تب سمیعہ آپا جو اب اپنے گھر میں خوش تھیں' ان کی شادی کے لیے مچل اٹھیں۔ ہر خاندانی تقریب میں ڈھیروں لڑکیاں انہیں دکھا ڈالتیں اور وہ جھنجلا جاتے۔

"آخر سمیعہ آپا سمجھ کیوں نہیں جاتیں۔" وہ بیزار ہو کر سوچتے۔

"سمیعہ آپا! یہ اتنی بڑی سی لڑکی آپ کو چلتی پھرتی دکھائی نہیں دیتی اس گھر میں' جو آپ مجھے رنگ برنگی لڑکیاں دکھاتی پھرتی ہیں۔" ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"کون۔۔۔؟" انہوں نے تجاہل عارفانہ کی حد کر دی۔

"میں زونی کی بات کر رہا ہوں۔" انہوں نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"کیوں زونی ہی کیوں اور لڑکیاں بھی تو ہیں اس خاندان میں اور خاندان کے باہر۔" چڑ کر انہوں نے کہا۔ افراز احمد کا ٹھکرانا انہیں یاد تھا۔ حالانکہ ان غریب کو تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے اس قسم کے جذبات رکھتی ہیں۔

"اور کوئی بھی نہیں سوائے زونی کے۔" ان کا لہجہ اٹل تھا۔

"ابا میاں کا احسان اتارنا چاہتے ہو؟"

"کیوں' کوئی عیب ہے کیا اس میں؟" وہ چڑ کر

بولے۔

"پھر..."

"مجھے وہ اچھی لگتی ہے بس اس لیے، آپ ابا میاں سے بات کریں۔"

"ارے بھئی! وہ تو دل و جان سے تیار ہو جائیں گے، بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ انہیں کہاں ملے گا مگر سن لو، مجھے زونی نہیں پسند ــــ تمہارے لیے۔" ان کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"لیکن میں اور زونی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"اوہو اچھا... وہ بھی..." ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہمیں خبر بھی نہیں، کب سے ہو رہا ہے یہ کھیل بھئی۔"

"آپا پلیز... آپ نہیں کریں گی تو میں اماں بی سے خود بات کر لوں گا۔" ان کے انداز پر ہارون نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

ہوا وہی جو ہارون احمد نے چاہا۔ یوں ان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی تھی اور بظاہر سمیعہ آپا بھی بڑی خوشی خوشی شریک ہوئی تھیں۔

سمیعہ آپا آج کل زونی پر خوب مہربان تھیں۔ یہی بات اکثر اسے حیرت میں ڈالتی تھی، ورنہ منگنی سے پہلے تو وہ اسے زیادہ منہ ہی نہیں لگاتی تھیں۔ اکثر چھٹی والے دن وہ اسے اپنے گھر لے جاتی تھیں اور پھر عدیل احمد کے پاس بٹھا کر وہ گھنٹوں کے لیے خود کسی کام میں مصروف ہو جاتی تھیں اور وہ مارے مروّت کے عدیل احمد کے پاس سے ہلتی ہی نہیں تھی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی تھی اور وہ بھی اپنے مخصوص دھیمے انداز میں اس سے کتنی ہی باتیں کر ڈالتے تھے۔

"آپا! ہٹیں، میں روٹیاں بنا دوں گی۔ آپ عدیل بھائی کے پاس جائیں۔" جب وہ باتیں کر کر کے تھک جاتی تو اٹھ جاتی۔

"نہیں جانو! تم جاؤ وہیں، ان کے پاس بیٹھو۔ میں بس ابھی آتی ہوں۔ یہ چار روٹیاں رہ گئی ہیں بلکہ تم ایسا کرو، یہ چائے لے جاؤ ان کے لیے۔" وہ اسے دوبارہ ان کے پاس روانہ کر دیتیں۔

زونیرہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ سمیعہ آپا کی چالاکیوں کو سمجھ نہیں پائی۔ وہ تھی ہی ایسی صاف دل، صاف ذہن اور صاف نظر۔ اس کے ذہن میں کوئی برا خیال آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے تو بس ہارون احمد کا خیال ہی کافی تھا جو اسے ہمیشہ مسرور رکھتا تھا۔

ہفتہ کی رات شاید اس کی زندگی کی بدترین رات تھی۔

وہ اماں بی اور بھابھی کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ سمیعہ آپا اور عدیل بھائی کو آنا تھا کھانے پر۔ سوائے ابا میاں کے گھر کے سارے مرد اپنے اپنے کام دھندوں پر تھے۔

جب وہ کچن سے نکلی اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ آپا ابھی ہی آئی تھیں۔

"ہائیں... کیسے پھر رہی ہو؟"

"بس نہانے جا رہی تھی۔" عدیل احمد کو سلام کر کے وہ اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"لاؤ، میں تمہارے کپڑے استری کر دیتی ہوں۔"

"دھلے ہوئے ہیں سمیعہ آپا! بس یہ دوپٹہ ہے۔ میں نہا کر نکلوں گی، تب کر لوں گی۔" ان کی اتنی محبت پر وہ جیسے نہال ہو کر مسکراتے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔

وہ نہا کر اپنے بال سلجھا رہی تھی۔ سیاہ گھنے بالوں سے ٹپکتے ننھے ننھے پانی کے قطروں نے شرٹ کو اچھا خاصا گیلا کر دیا تھا۔

اس نے تولیہ کرسی پر پھیلاتے ہوئے دوپٹے کی تلاش میں نظر گھمائی تھی۔

"یہیں تو رکھا تھا، کہاں گیا۔"

"یہ لیں بھئی! اپنا دوپٹہ۔ آپ کی آپا نے استری کر دیا ہے۔" دستک دے کر عدیل احمد کمرے میں چلے آئے۔ ہاتھ میں اس کا دوپٹہ تھا جس کا سوٹ وہ پہنے ہوئی تھی۔ وہ ایکدم ہی ہڑبڑا گئی۔ مہلت ہی نہ ملی تھی کہ کوئی اور چیز کاندھوں پر ڈال لیتی۔

"یہ آپ کے پاس..." اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

ایک تو بغیر دوپٹے ان کا سامنا ہونے پر، دوسرے اپنا ہی دوپٹہ ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر عجیب سی کیفیت ہوئی۔ اس نے تولیے کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر وہ تو اس نے عدیل احمد کے قریب پڑی کرسی پر خود ہی تو پھیلایا تھا۔

"ارے بھئی لڑکی! یہ دیکھو، اس کرسی پر لٹکا دیتا ہوں۔ تم تو میرا پسندیدہ پروگرام ہی نکلوا دے رہی ہو۔"

انہیں شاید کچھ احساس ہوا تھا، وہ اس کا دوپٹہ لیے کرسی کی طرف بڑھے تھے اور یہی وہ وقت تھا جب کھلے دروازے سے سمیعہ آپا نے ابا میاں کے ساتھ نہایت ہی ڈرامائی انداز میں انٹری دی۔

"ارے..." اندر کا منظر دیکھتے ہی نہایت ہی ماہرانہ انداز میں انہوں نے اپنے سینے پر دوہتھڑ مارے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ اڑتی ہوئی رنگت کے ساتھ باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھیں، منظر ہی کچھ ایسا تھا۔

عدیل احمد کے ہاتھ میں اس کا دوپٹہ تھا جبکہ وہ خود کمرے کے بیچوں بیچ بنا دوپٹے کے بھیگی بھیگی سی کھڑی تھی، الجھے سلجھے بالوں کے ساتھ۔

یہ منظر بالکل ان کی توقع کے مطابق ہی تھا۔ وہ مطمئن ہو کر ابا میاں کی طرف مڑیں۔ جو سرخ تمتماتا چہرہ لیے نظریں جھکائے کھڑے تھے۔

"ابا میاں...!" جیسے ان کی آواز لرزنے لگی۔

"دیکھیں ابا میاں! یہ دونوں۔" ان کی فریادی نظریں ابا میاں پر تھیں۔ وہ یکدم باہر کی طرف پلٹے تھے۔

"ابا میاں...! میری بات سنیں ابا میاں..." "نہیں" کہہ کر زونی کو ایکدم سے ہوش آیا تھا۔ عدیل احمد کے ہاتھ سے دوپٹہ چھینتی وہ گرتی پڑتی ابا میاں کے پیچھے بھاگی۔

"میرے سامنے مت آؤ۔" وہ پلٹ کر غرائے تھے اور تیز قدموں سے اپنے کمرے میں گھس گئے۔

"ابا میاں..." وہ جیسے سکتے میں آ گئی، دوسرے ہی لمحے وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھی رو رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے سمیعہ؟ آپ ہی نے تو یہ دوپٹہ دیا تھا زونی کو دینے کے لیے۔" عدیل احمد کا لہجہ اچھی خاصی ناگواری لیے ہوئے تھا۔

"میں نے کب دیا آپ کو؟" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اب انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"ہاں... ہاں... یہ چاند میرا ہی چڑھایا ہوا ہے۔ میں نے ہی دونوں کو مل بیٹھنے کے موقع دیا اور تم نے مجھے ڈس لیا۔ سگی نہ سہی، بہن تو تھی تمہاری۔ تمہارے باپ کے بھائی کی اولاد تو تھی۔ خون کا رشتہ تو تھا تم سے۔ میری ایک خوشی تم سے نہ دیکھی گئی۔ مجھے کیا پتا تھا، یوں اتنی اتنی دیر تک اکٹھے بیٹھنا، مذاق کرنا ایک دن یہ رنگ دکھائے گا۔ تم نہ سہی، میں نے تو تمہیں ایک بہن کی طرح چاہا تھا اور تم نے میرے ہی شوہر کے ساتھ..."

وہ رو رہی تھیں۔ زور زور سے بول رہی تھیں اور عدیل احمد انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جو خیال ان کے دل و دماغ میں کہیں بھی نہیں تھا، وہ اسے کس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی تھیں۔

"میرے بھائی نے میری ہزار مخالفت کے باوجود تم سے ہی رشتہ جوڑا، اس کی محبت کی بھی قدر نہ کی تم نے۔ اسے بھی دھوکا دیا۔" وہ روتے ہوئے چیخ رہی تھیں۔ ان کی آواز سن کر سب سے پہلے اماں بی اندر آئی تھیں پھر بھابھی۔

کارپٹ پر بیٹھی روتی ہوئی زونیرہ اور سمیعہ آپا کا واویلا۔

اصل صورت حال کا پتا چلتے ہی ان کے ہاتھ پیروں سے گویا جان نکلتی چلی گئی۔

عدیل احمد اسی وقت گھر سے چلے گئے تھے اور روتی ہوئی سمیعہ آپا، ابا میاں کے کمرے میں۔

اب کم از کم وہ اپنے بھائی کو تو چھٹکارا دلا ہی سکتی تھیں زونی سے۔ جب انہیں اپنی محبت نہ ملی تو زونیرہ

احمد کو کیوں اپنا مقصود ملے، چاہے وہ ان کا بھائی ہی کیوں نہ ہو اور زونیرہ احمد ان کے بھائی کی خوشی۔

عدیل احمد کو تو وہ منا لیں گی، وہ تھے ہی اتنے ٹھنڈے مزاج کے۔ انہوں نے طمانیت سے سوچا تھا۔

* * *

"زونی....!" اس نے بمشکل تمام سوجی ہوئی آنکھیں کھولی تھیں۔

ہارون احمد دروازے پر کھڑے تھے۔ اس کے اندر ایک سکون سا اتر آیا۔ کوئی تو تھا جو اسے بے قصور سمجھتا تھا۔

"ہارون.... ہارون.... یہ سب غلط ہے، جھوٹ بول رہی ہیں سمیعہ آپا۔ عدیل بھائی تو میرے بھائیوں جیسے ہیں۔ میں ایسا کر سکتی ہوں کیا، آپ ایسا سوچ سکتے ہیں۔" انہیں دیکھتے ہی وہ ایکدم سے بکھری تھی۔

"کتنا لڑا تھا میں تمہارے لیے آپا سے مگر آج.... آج مجھے...." وہ کہتے کہتے رک گئے تھے مگر زونیرہ احمد پر تو گویا پہاڑ سا گرا گئے تھے اپنے بے یقین لفظوں سے۔

"تم بھی.... تم بھی یقین نہیں کرو گے میری بے گناہی کا۔" اس کے لب کپکپا کر رہ گئے لیکن منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

"تمہارے سامنے بھی مجھے صفائی پیش کرنے کی ضرورت ہے کیا۔ تم تو بغیر کہے میری ہر بات جان جایا کرتے تھے، پھر آج اتنی بڑی بات کیسے سمجھ نہ پائے۔" وہ انہیں دیکھتی رہی اور آنسو دل پر گرتے رہے۔

"مجھے تو سب کچھ ٹھیک سے بتاؤ زونی! آخر ہوا کیا تھا۔" ان کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔

عجیب سی بے چینی، بے قراری، کچھ جان لینے کا تجسس جیسے اس نے جو کچھ سب کو بتایا ہے، وہ جھوٹ تھا۔ اصل بات تو وہ انہیں ہی بتائے گی۔ اس نے دکھ سے آنکھیں بند کر لی تھیں، ہارون احمد کے اس انداز پر۔

وہ جو ان کی آمد پر بہت پرسکون ہو گئی تھی کہ شاید اس پر کیا ہوا اعتماد انہیں یہاں تک کھینچ لایا ہے مگر ان کا سوال اسے سُن کر گیا تھا۔

"مجھے تو...." اسے تو جیسے بچھو نے ڈنک مارا تھا جیسے باقی سب سے اس نے کہیں کے قصے گھڑے تھے۔ اس کے اندر جیسے برف سی اتر آئی تھی، ان کے لیے سارے جذبے جیسے ایکدم ہی سرد پڑ گئے تھے۔

"آپ کیا سننا چاہتے ہیں؟" جذبوں کے ساتھ ساتھ آواز بھی سرد پڑ گئی تھی۔

"سچ۔"

"سچ وہی ہے جو میں نے سب کو بتایا ہے۔" اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے اسے کافی جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا، انہیں دھکے مار کر اپنے کمرے سے نکال دے۔

"اور جو سب کہہ رہے ہیں؟"

"کہہ تو آپ بھی وہی رہے ہیں۔" اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" ان کی زبان ذرا سی لڑکھڑا گئی تھی۔

"کل کو منہ سے بھی کہہ دیں گے۔"

"کچھ تو ہے نا۔ سمیعہ آپا نے کچھ تو دیکھا ہو گا تب ہی...." وہ چڑ سے گئے۔

"آپ نے تو کل کا بھی انتظار نہیں کیا۔" کتنی سرد مسکراہٹ تھی اس کی جو ہارون احمد کی جان جلا گئی تھی۔

"میرا ہی خیال کر کے میری بہن کو بخش دیتیں۔" ایک اور تیر۔

وہ چپ رہی۔

"میں کافی نہیں تھا تمہیں سراہنے کے لیے جو تم نے ایک شادی شدہ مرد کو...."

"اپنی زبان کو لگام دیجیے۔" وہ بری طرح چلائی۔

"کس کس کی زبان روکو گی زونیرہ احمد!"

"میں نے کہا کہ آپ چپ ہو جائیے۔" وہ تو جیسے ضبط کی حدوں کو چھو رہی تھی۔

"سچ تو تمہیں سننا ہی پڑے گا۔" ان کا چہرہ غصے سے

دہک رہا تھا۔

"چلے جائیے، چلے جائیے یہاں سے۔" اس کا خون بری طرح کھول رہا تھا۔

اتنا رکیک الزام۔ اس کا دل چاہا وہ ہارون احمد کا گلا گھونٹ دے۔ اس نے ایک تلخ نگاہ ان پر ڈالی تھی۔

"مجھے آج اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے آپ سے محبت کی۔" وہ کہنے لگی تھی۔

"اور جانے سے پہلے یہ سن لیجیے۔ کبھی سچ آپ کے سامنے آیا بھی تو کوئی کندھا نہیں ملے گا رونے کو۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

نفرت بھرے لہجے میں کہتی وہ واش روم میں بند ہو گئی۔

اور اسی دن وہ سمیعہ آپا کو لے کر اس گھر سے چلے گئے تھے۔

آج اماں بی تین دن بعد اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ بھابھی بھی ان کے ساتھ تھیں۔

"اماں بی! کیا آپ بھی مجھے۔" آگے آنسوؤں نے بات مکمل کرنے نہ دی۔

"پر آنکھوں دیکھا کیسے جھٹلاؤں۔" خود اماں بی کے آنسو بہہ نکلے تھے اس کی حالت دیکھ کر۔ تین روز سے جو اس کی حالت تھی، وہ ان کا کلیجہ کاٹے دے رہی تھی۔

ملگجے کپڑے، بکھرے بال اور سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اسے بے گناہ ثابت کیے دے رہی تھیں۔

"اماں بی! میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ کو مجھ پر یقین ہے نا۔ آپ کی زونی ایسا کر سکتی ہے کیا؟" وہ اماں بی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ماں صدقے، تیری ہر بات پر یقین ہے مجھے۔" وہ بھی رو دیں۔

"بھابھی! ابا میاں سے کہیں بس ایک دفعہ مجھ سے بات کر لیں۔ انہیں کیا اپنی زونی پر بھروسہ نہیں رہا۔" اس کے ملتجی انداز پر ان کا دل بھر آیا۔

"سب کو تم پر بھروسہ ہے۔ ہم تمہیں جانتے نہیں ہیں کیا۔"

"تو پھر ابا میاں..." وہ پھر سے رو دی۔

اب وہ اسے کیا بتاتیں کہ سمیعہ نے اس قصے کو کس قدر اچھالا تھا۔

❋ ❋ ❋

اتنا بڑا الزام لگانے کے بعد سمیعہ آپا کو پہلا جھٹکا اس وقت لگا، جب عدیل احمد کی طرف سے انہیں طلاق کی رجسٹری ملی تھی۔ وہ تو اس دن کے بعد سے گھر ہی نہیں آئے تھے۔ سمیعہ آپا پر تو جیسے بجلی گر پڑی تھی جس بات کو وہ بہت آسان سمجھ رہی تھیں، وہ اتنی تھی نہیں۔

"تمہارا فون ہے زونی!" بھابھی کارڈلیس اسے تھما گئی تھیں۔ دوسری طرف عدیل احمد تھے۔

"عدیل بھائی!" وہ ان کی آواز سنتے ہی رو پڑی تھی۔

"زونیرہ پلیز... چپ ہو جائیے، مجھے آپ سے صرف ایک بات پوچھنا ہے۔" ان کا لہجہ ٹھہرا ہوا مگر سپاٹ تھا۔

"جی...!" ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟" ان کے اس سوال پر زونیرہ کے آنسو حیرت کے مارے جیسے بہنا بھول گئے۔

"ابا میاں... ابا میاں... ایک دفعہ دروازہ تو کھولیے اپنی زونی کی بات تو سن لیجیے۔ ابا میاں..." دروازہ پیٹ پیٹ کر اس کے ہاتھ شل ہو گئے تھے مگر ابا میاں نے اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اس کی طرف سے جیسے آنکھیں ہی بند کر لی تھیں۔

"ایک بار تو اس کی بھی سن لیجیے۔" اماں بی رو رہی تھیں۔

"آنکھوں دیکھا جھٹلا دوں، اس عمر میں ہمارے سر پر خاک ڈلوا کر وہ اب اور کیا چاہتی ہے۔ آپ تیاری کر لیجیے، کل شام عدیل احمد آئیں گے چار لوگوں کو لے کر۔"

اماں بی کے سر پر گویا بم کا دھماکہ کر کے وہ اندر چلے گئے تھے۔ وہ جو تین روز سے رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی

اسے امید تھی کہ ابا میاں کا غصہ جب اتر جائے گا تو وہ اس کی بات ضرور سنیں گے۔ ان کا اس قدر ظالمانہ اور یک طرفہ فیصلہ سن کر گویا پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ تین دن سے بہتے آنسو گویا اب آنکھوں ہی میں منجمد ہو گئے تھے۔

یہ خبر سمیعہ آپا پر جیسے بم کے گولے کی طرح پھٹی تھی۔ عدت کی وجہ سے وہ آ نہیں سکتی تھیں مگر ان کا ایک اگلا فون ضرور آیا تھا۔

"تمہیں وہی ملا تھا شادی کرنے کو۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ قتل کر دیں زونیرہ احمد کو۔ غم و غصے سے برا حال تھا۔

کیا پتا تھا عدیل احمد انہیں یوں چھوڑ دیں گے۔ یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اسی سے شادی بھی کر لیں گے۔

"آپ نے جو الزام لگائے تھے، انہیں سچ بھی تو ثابت کرنا تھا۔" آج زونیرہ احمد نے بڑے ٹھوس لہجے میں ان سے کہا تھا۔

"آپ نے میرے حوالے سے دیکھے گئے اپنے بھائی کے خواب حسد میں آ کر راکھ کر دیے۔ بدگمانی بھر دی آپ نے اس کے دل میں اس جھوٹے اور گھٹیا الزام سے۔ آپ مجھ سے کہتیں، میں ہارون احمد کے راستے سے ہٹ جاؤں تو میں کوئی سوال کیے بغیر ویسے ہی ہٹ جاتی، یہ گھٹیا سازش کیوں کی آپ نے۔ میرا دل اجاڑتے وقت مجھے جیتے جی مارتے وقت آپ بھول گئی تھیں کہ اللہ اوپر بیٹھا ہے۔ آپ کا گھر بھی اجڑ سکتا ہے، آپ نے سوچا بھی نہ ہو گا۔ میں نہیں، اللہ تو سب کچھ کر سکتا ہے نا۔"

"تم... عدیل احمد سے شادی نہ کرو۔"

"اب مجھے عدیل احمد ہی سے شادی کرنا ہے۔ صرف وہی جانتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں۔ آپ نے تو سارے زمانے میں جھنڈے گاڑ دیے ہیں میری بدنامی کے۔ کون اپنائے گا مجھے اب۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے لگائے گئے الزامات درست ثابت ہونے جا رہے ہیں۔ پوری دنیا آپ کو داد دے رہی ہے، رحم کھا رہی ہے آپ پر اور لعنت بھیج رہی ہے مجھ پر۔ جیت گئی ہیں آپ، بچا لیا ہے آپ نے اپنے بھائی کو مجھ سے۔" طنزیہ لہجے میں کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس نکاح کی سب سے زیادہ مخالفت دونوں بھائیوں نے کی تھی مگر ابا میاں اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے تھے۔ بس اتنا ہی کہا تھا۔

"اگر اس سلسلے میں مزید ان سے بات کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ اس گھر کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

نکاح کی شام اس نے عدیل احمد کا لایا ہوا سادہ سا جوڑا پہنا تھا۔ بھابھی نے جو زیور دیا، اس نے خاموشی سے پہن لیا تھا۔

رخصتی کے وقت نواز بھائی کے ہاتھ اس کے سر پر کانپ رہے تھے۔ کاش وہ ابا میاں کو ان کا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتے۔ انہوں نے بے بسی سے سوچا تھا۔

"کاش ابا میاں سمیعہ کے بجائے اپنی بیٹی پر اعتماد کرتے۔" افراز بھائی اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے مگر اس نے ایک آنسو نہ بہایا تھا۔ سرد سپاٹ چہرہ لیے وہ روبوٹ کی طرح سارے فرائض انجام دیتی رہی تھی۔

وہ کیسی حسین گڑیا جیسی لگ رہی تھی اس سادگی میں بھی۔ دلہن کا روپ نہ تھا مگر شادی تو ہوئی تھی۔ اماں بی نے اس کی شادی کے حوالے سے کتنے خواب دیکھے تھے۔ بچھڑنا تو تھا ایک دن مگر اس طرح... یوں... ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ جھلملاتی آنکھیں لیے وہ اس سے دور دور ہی رہیں۔ کہیں ضبط نہ ٹوٹ جائے، کہیں مجازی خدا کی نافرمانی نہ ہو جائے۔

"آج کے بعد ہم میں سے کسی کا بھی تم سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ تمہیں کچھ اور لینا ہے تو تم اس گھر سے لے لو۔" ابا میاں نے اسے رخصت کرتے وقت سرد آواز میں کہا۔

"مجھے اماں بی چاہئیں، مجھے وہ ابا میاں چاہئیں جو بس مجھ سے محبت کرتے تھے، میرے لاڈ اٹھاتے تھے۔ مجھے

اپنے بھائی چاہئیں جو میری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔" اس کے دل اپنے خون کے رشتوں کی گردان کی تھی۔ اس کا مطالبہ کیا تھا۔

"مجھے وہ اعتماد چاہیے جس نے میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا۔ پھولوں کی طرح پالا اور اتنا بڑا کردیا مگر اعتبار نہ کیا۔ جی بھر کے مارتے 'گالیاں دیتے مگر اعتبار تو کرتے تاکہ بے گناہ ہونے کے باوجود جو سر آج ہمیشہ کے لیے جھک گیا ہے' کبھی نہ جھکتا۔"

"جاؤ..... اور اب ہمیں کبھی مت آزمانا۔ آج سے اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہیں۔"

"جب دل کے دروازے ہی بند ہوجائیں تو گھر کے دروازے کھلے ہوں یا بند' کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے جیسے خود سے کہا پھر عدیل احمد کی طرف پلٹی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

اندر آکر اماں بی کا دیا ہوا سارا زیور اس نے اتار کر وہیں برآمدے میں پڑے تخت پر رکھ دیا تھا' مع اس چیک جو ابا میاں نے اسے جہیز کی جگہ دیا تھا۔

اس گھر سے نکلتے وقت کتنی ہی چیزوں نے اس کا دامن تھاما تھا' وہ سرخ پھولوں والی بیل جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اور جو اب تیسری منزل تک پہنچ گئی تھی اور جس کے سائے تلے بیٹھ کر اکثر وہ کوئی نہ کوئی کتاب پڑھا کرتی تھی اور وہ پھولوں سے بھری بیل وقفے وقفے سے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اس کے اوپر پھول برساتی رہتی تھی۔ وہ مینا جو ابا میاں نے اسے لاکردی تھی جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے دانہ پانی ڈالا کرتی تھی اور جو صرف اسی کو دیکھ کر شور مچاتی تھی۔ گویا باقی سب کی شکایت کررہی ہو اس سے' یا وہ چھوٹی چھوٹی گرے پروں اور کالی چونچ والی چڑیاں جو اسے دیکھتے ہی اتنا شور مچاتی تھیں' گویا ان سب میں سے ہر ایک کی خواہش ہو کہ پہلے اسی کی بات سنی جائے۔ ایسی ہی ان گنت چیزیں اور یادیں تھیں جو اس کے راستے میں آئی تھیں۔

آج بھی جب وہ عدیل احمد کے ہمراہ اس گھر سے نکلی تھی تو ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ ہمیشہ سے کہیں زیادہ پھول اس پر برسے تھے' ساتھ ہی اس کی آنکھیں۔

"مت جاؤ۔" پھولوں کی مہک نے دور تک پیچھا کیا تھا۔

شادی کے فوراً بعد وہ عدیل احمد کے ہمراہ اسلام آباد آگئی تھی' جنہوں نے احمد حسن کے نام سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا' پھر زندگی صرف عدیل احمد کے سہارے ہی گزری تھی۔ سب لوگ کیسے تھے' کہاں تھے' انہیں یاد کرتے تھے یا نہیں' اسے کچھ خبر نہ تھی۔ عدیل احمد نے انہیں زندگی میں سب کچھ دیا' سب سے بڑھ کر عزت۔ شادی کے دو سال بعد مژگان ان کی گود میں آئی تھی' تب ان دونوں کو لگا کہ زندگی اب کچھ مہربان ہوگئی ہے ان پر۔

❊ ❊ ❊

"اماں بی! میری ناک دکھ رہی ہے۔" شام کو جب اماں بی برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھی تھیں' تب فریا آئی تھی ان کے پاس۔ پچھلے دنوں ہی ناک چھدوائی تھی اس نے' جب سے ہی مصیبت میں تھی۔ کبھی منہ دھوتے ہوئے زور سے ہاتھ لگ جاتا تھا' کبھی سوتے ہوئے ہاتھ پڑ جاتا تھا' کبھی کپڑے بدلتے ہوئے کپڑا اٹک جاتا تھا۔

"اب کیا آفت آگئی اس پر۔ صحیح تو ہوگئی تھی اچھی خاصی۔" ناگواری سے اسے دیکھ کر کہا۔

"سوتے میں تکیے کی کڑھائی کے دھاگے میں پھنس گئی تھی بالی' خون بھی نکلا تھا۔" اس نے بے نیازی سے بتایا۔

"دس دفعہ کہا ہے' اوندھے منہ مت سویا کرو۔" سن کر تکلیف تو ہوئی تھی' مگر گھرکی دینا ضروری تھی۔

"سیدھی سو رہی تھی' تکیہ منہ پر تھا۔"

"دم نہیں گھٹا تمہارا بیٹی!" اس جواب پر وہ سلگ ہی تو گئیں۔

"خودکشی تھوڑی کررہی تھی اماں بی!" اس نے ترنت جواب دیا۔

"دوا لکھوالو کوئی دانی سے ٹیلی فون پر۔" وہ بیزار ہو گئیں۔

"بات ہوئی تھی میری' دوا لگا رہی ہوں۔"

"پھر۔"

"بہت درد ہو رہا ہے اماں بی! یہ بالی اتار دوں۔"

"بند ہوجائے گی ناک۔"

"سوراخ اماں بی..." اس نے تصحیح کی تھی۔

"ہاں' ہاں وہی۔ یہی کہا جاتا ہے عموماً" کہ ناک بند ہوگئی۔" اس کی تصحیح ناگوار گزری تھی۔

"تو ہونے دیں بند' خرچا بھی بچے گا۔"

"ہاں' ایک نتھ کا خرچا بچا کر تو گھر بھر لیں گے تمہارے باوا۔"

"ادھر آ... دیکھوں تو..." انہوں نے قریب بلایا۔

"میرا چشمہ لاؤ مژگان!" مژگان کو برآمدے میں آتا دیکھ کر انہوں نے اس سے اپنا چشمہ منگوایا تھا۔

"اچھا اماں بی!" وہ وہیں سے پلٹ گئی۔

"یہ تو اچھی خاصی سوج گئی ہے' نیم کا تنکا ڈال دیتی ہوں۔" انہوں نے بغور معائنہ کیا۔

"اب سنبھال لو اپنی ناک شادی و لیمے تک کے لیے۔" تنکا ڈال دیا تھا انہوں نے بالی اتار کر۔ اسے بڑا سا سکون محسوس ہوا۔

"اس کے بعد بند کردوں اماں بی!" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"پھر اپنے میاں سے پوچھنا' وہ کہے تو کاٹ بھی دینا۔" بیزاری سے انہوں نے کہا۔

"نیم کے تنکے رکھ دینا اس کے پرس میں۔ شادی والے دن نتھ اتارتے ہی تنکا ڈال لے گی۔" مژگان کی طرف مڑ کر ہدایت کی۔

"اب وہاں جاکر کون ڈالے گا اماں بی! رخصتی کے وقت آپ میری نتھ اتار کر وہیں تنکا ڈال دیجیے گا۔"

اماں بی نے چڑ کر اسے دیکھا مگر چپ رہیں اور پیروں میں چپل ڈال کر کھڑی ہوگئیں۔

"اندر جا رہی ہوں میں۔"

مژگان نے شکر ادا کیا کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ "احمد سے ڈلوالوں گی۔"

"تمہارا نام کس نے رکھا تھا؟" مژگان سے اس نے پوچھا۔

"پاپا نے۔" وہ ہلکے سے مسکرادی۔

"ان گھنی گھنی پلکوں کی وجہ سے؟" فریا نے اس کی بالکل سیاہ آنکھوں پر اوپر سے ذرا سی مڑی ہوئی پلکوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

"پتا نہیں۔" وہ ہنس دی۔

گالوں میں پڑتا گڑھا مزید نمایاں ہوگیا تھا۔

"میرا بس چلے تو کہیں چھپا کر رکھ دوں تمہیں۔" بے اختیار ہی اس نے کہا۔

"ارے..." وہ ذرا سا جھینپ گئی۔

"چلو' اندر چلتے ہیں' اماں بی کے پاس۔" وہ کھڑی ہوئی۔

"میں نہیں جا رہی' پھر مراۃ العروس سنانا شروع کردیں گی مجھے۔" وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ لیٹ گئی۔

"شادی نہیں ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے قیامت آرہی ہے اس دن۔ ہر وقت نصیحت کرتی رہتی ہیں۔ زبان بند رکھنا۔ کبھی میاں کے آگے' سسرال والوں کے آگے زبان نہ کھولنا۔ ارے اگر سارا فساد ہی میری زبان کا ہے تو کاٹ کر رکھ لیں یہیں اور فریم کروا کر لٹکوالیں اپنے کمرے میں۔ اکبری سمجھا ہوا ہے مجھے۔" وہ اچھی خاصی عاجز آئی ہوئی تھی۔ آخری بات پر مژگان کو ہنسی آگئی تھی۔

"جس جس کو ادھر ادھر ہونا ہے' وہ ہوجائے۔ احمد بھائی آرہے ہیں۔" اچانک ہی نبیل کی آواز آئی تھی۔ وہ غالباً" گیٹ ہی سے بلند آواز میں بولتا اندر کی طرف آرہا تھا۔

مژگان سے پہلے کھڑی ہونے والی فریا تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" حیرت سے اس نے فریا کو دیکھا جس کی شکل پر اچھا خاصا ہونق پن طاری ہوگیا تھا' نبیل کا اعلان سن کر۔

"کچن میں۔" جواب دے کر دوسرے ہی لمحے وہ برآمدے سے نکل گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" اس کے پیچھے وہ بھی نکلی۔

"اب وہ کچن کی طرف جا رہے ہیں۔" نبیل کی آواز تھی کہ پھٹا بانس' دوسرے ہی لمحے فریا بی بی کچن سے نکل کر مژگان کے کمرے کا رخ کر چکی تھیں۔

"تم چپ نہیں رہ سکتے۔" احمد کی جھلاہٹ بھری آواز آئی تھی۔ وہ کچن سے نکلتا رنگین آنچل دیکھ چکا تھا۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا پانی پینا ہے' کچن میں جا رہا ہوں۔" مسکراہٹ کا گلا گھونٹ کر اس نے بڑی سنجیدگی سے تلملاتے ہوئے احمد کو دیکھا۔

"تو اعلان کرنے کو کس نے کہا تھا۔" غرا کر اس نے کہا۔

"مگر اب تو وہ گئیں کمرے میں۔" معصومیت سے کہتا اس سے کچھ دور ہٹ گیا۔

"احمد آیا ہے۔" اماں بی بھی کمرے سے نکل آئیں۔

"دیکھ لوں گا تمہیں بچو۔"

گہرا سانس لے کر وہ اماں بی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیسی ہیں اماں بی آپ؟" سلام کر کے ان کے سامنے جھکا تھا۔

"خوش رہو' ٹھیک تو ہو۔" سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"سب خیریت ہے۔ یہاں سے گزر رہا تھا' سوچا آپ سے ملتا چلوں۔"

"اچھا آپ اماں بی سے ملنے آئے ہیں۔" نبیل کی حیرت زدہ آواز پر سر اٹھا کر صرف اسے دیکھا۔

"جاؤ مژگان کو بلا لاؤ۔" ابھی تو دونوں یہیں تخت پر بیٹھی تھیں۔

احمد سے وہ پہلی بار مل رہی تھی۔

"احمد ہے یہ... اپنی فریا والا۔" آہستہ سے صرف اسے بتایا۔

"اچھا..." اسے سلام کر کے ایکدم سے ہنس دی۔ فریا کی ساری بھاگ دوڑ سمجھ میں آ گئی تھی۔

"احمد بھائی! آپ ادھر ہی آ جائیں۔" وہ اسے لاؤنج میں لے کر جا رہی تھی' تب ہی اماں بی بول پڑی تھیں۔

"نہیں' یہ میرے کمرے میں بیٹھے گا۔"

"اچھا!" اسے پھر سے ہنسی آ گئی۔

"آ جائیں احمد بھائی ادھر ہی۔"

"فریا کو ادھر مت آنے دینا۔" اماں بی نے دھیرے سے مژگان سے کہا تھا مگر نبیل نے بھی سن لیا تھا اور احمد نے بھی۔

"اسی لیے تو آئے ہیں وہ۔" بے اختیار ہی نبیل کی زبان پھسل گئی تھی پھر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف بھاگا تھا۔

اس کی زبان سی دوں گی میں کسی دن۔" جھنجلا کر بولیں۔

"آپ تو جانتے ہیں احمد بھائی! اس کے مذاق تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ بیٹھیں' میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

اماں بی نے کافی دیر انتظار کیا مگر وہ لوٹی نہیں تھی چائے لے کر۔

"دیکھو جا کر کہاں رہ گئی۔" وہ تھک کر لیٹ گئی تھیں۔ وہ شکر کرتا کمرے سے نکل آیا۔

"یہ تم اتنا شرماتی ہو احمد بھائی سے؟" چائے کپوں میں ڈالتے ہوئے وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"شرماتی ورماتی نہیں ہوں۔ بس اماں بی نے کہہ دیا ہے شادی قریب ہے' وہ آئے تو تم نظر نہ آؤ۔" اس نے بتایا۔

"اچھا...!"

"مجھے تو یہاں پنڈی آنے ہی نہیں دے رہی تھیں' وہ تو تمہاری وجہ سے اجازت مل گئی۔"

"اماں بی اتنی سخت ہیں؟" حیران ہو کر اس نے پوچھا۔

"نہیں' بس اس معاملے میں تھوڑی سخت ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے کلاس ہوئی تھی میری۔ احمد آیا تو آس پاس منڈلاتی نظر آئی تو اسی وقت ٹانگیں توڑ دوں گی' سمجھ گئی۔ اِدھر اُدھر ہو جانا اگر وہ آئے تو۔" اس نے اماں بی کی بڑی اچھی نقل اتاری۔

"اب انہیں کیا پتا' میری تو ہر دو دن چھوڑ کر اس سے بات ہوتی ہے۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"آج تو ملنے آیا تھا۔" پیچھے سے آواز آئی۔

"ہائیں۔" وہ اچھل پڑی۔ پلٹ کر دیکھا' وہ دروازے میں کھڑا تھا۔

"اماں بی کہاں ہیں؟" سلام کر کے فوراً پوچھا۔

"لیٹ گئی ہیں۔" وہ اطمینان سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اس کے سامنے۔

"کیسے لیٹیں اس وقت۔" مژگان کے بھی ہاتھ پاؤں پھولے۔

"کیا مطلب' تکیے پر سر رکھا اور لیٹ گئیں۔" حیرانی سے احمد نے اسے دیکھا۔

"اُفوہ۔ میرا مطلب ہے وہ اس وقت لیٹتی تو نہیں ہیں۔" مژگان ذرا سا جھنجلائی۔

"نہیں' وہ تھیلے سے بلی باہر نکال رہی ہیں۔" فریا کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" مژگان گھبرا کر کچن سے نکلی۔ سامنے اماں بی کھڑی تھیں۔

"اماں بی! آپ..." اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"پلا دی چائے؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔ بالکل ایسے جیسے کہہ رہی ہوں' کرا دی ملاقات۔

"پی رہے ہیں۔" مری ہوئی آواز نکلی۔

"اچھا' میں بھی ایک کپ پیوں گی۔"

انہوں نے قدم کچن کی طرف بڑھائے۔

"جی اچھا۔" وہ بھی پلٹ کر مرے مرے قدموں سے کچن کی طرف چل دی۔

اندر گھستے ہی منہ سے گہرا سانس نکلا تھا۔ پورے کچن میں صرف احمد ٹیبل پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ فریا کہیں نہیں تھی۔

اس کی نظر جالی کے دروازے پر پڑی تھی' وہ بھی وہاں آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"اس دروازے میں تالا ڈلوانا ہے مجھے۔" انہوں نے احمد کو دیکھا۔

"اماں بی!" احمد کو ہنسی آ گئی اور خود وہ بھی ہنسنے لگیں۔

❋ ❋ ❋

اس نے ابا میاں کے پاس بیٹھی شخصیت کو بڑی حیرت سے دیکھا۔

اونچے لمبے سے' گرے پتلون اور اسی کی مناسبت سے پہنی گئی شرٹ۔ کنپٹیوں پر سفید ہوتے بال انہیں مزید گریس فل بنا رہے تھے۔

"آؤ بیٹی!" وہ اندر آ گئی۔

"یہ مژگان ہے' زونی کی بیٹی۔" ابا میاں کی آواز بہت ہلکی تھی۔

کتنی ہی دیر تک وہ اسے دیکھتے رہے پھر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"کیسی ہیں بیٹی آپ! کیا کرتی ہیں؟" اس کے سلام کا جواب دے کر وہ اس سے باتیں کرنے لگے تھے۔

"یہ تمہارے ہارون انکل ہیں۔" اس کا تعارف کرا کے ابا میاں نماز کے لیے اٹھ گئے تھے۔ آگے بتانے کی ابا میاں نے شاید ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اسے ضرورت تھی بھی نہیں۔ اماں بی ساری کہانی تو اسے سنا ہی چکی تھیں۔

وہ کافی دیر تک اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے گھر کے متعلق' پاپا کے متعلق' مما کی باتیں بتاتے رہے۔ وہ بیزار تو بہت ہوئی مگر تحمل سے ان کی باتوں کے جواب دیتی رہی۔

مما کی کہانی میں ان کا کردار سب سے زیادہ اہم تھا۔

❋ ❋ ❋

کوریڈور سے گزرتے ہوئے فون کی بیل نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"ہیلو...!"

"مژگان..." دوسری طرف کی آواز سن کر اس کا دل ایک دم سے دھڑکا تھا۔ کافی دن بعد اس سے بات ہو رہی تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟" سلام کر کے اس نے حال پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیے۔ اماں بی اور میرے بہن بھائی کیسے ہیں؟" خوش دلی سے دریافت کیا۔

"بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ابا میاں کو بلاتی ہوں۔"

"نہیں، ان سے تو میں رات میں بات کروں گا۔" بڑی عجلت بھری آواز میں اسے روکا۔

"پھر کس کو بلادوں؟"

"کیا میں آپ سے بات نہیں کر سکتا؟"

"جی....!"

"آپ کیسی ہیں؟"

"پورے بارہ دن بعد آپ نے مجھے فون کیا ہے۔" کہنے کچھ جا رہی تھی نکلا کیا تھا۔ سٹپٹا کر چپ ہو گئی۔

دوسری طرف لگا، سناٹا سا چھا گیا ہو۔

"میں ذرا مصروف تھا، آئی ایم سوری مژگان!" اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بولتے ہوئے مسکرا رہا ہو۔ "ان سے بات کریں۔" اپنے آپ پر ناراض ہوتے ہوئے سامنے سے آتے ابا میاں کو دیکھا جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے باہر نکلے تھے۔

"ابا میاں سے بات کرنا ہوتی تو ان کے پرسنل سیل پر نہ کر لیتا۔" اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"ہائیں۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا، دوسرے ہی لمحے فون ابا میاں کو تھما چکی تھی۔

* * *

فریا واپس جا چکی تھی نبیل کے ساتھ، اس کی وہی پرانی مصروفیات چل رہی تھیں۔ مما کی وہ تصویریں جو اس کے پاس تھیں، وہ اس نے اماں بی کے البم میں لگا دی تھیں۔ اس وقت بھی وہ دونوں تصویروں کا موازنہ کر رہی تھی۔ شادی سے پہلے کی ہر تصویر میں وہ مسکرا رہی تھیں، بھرپور انداز میں یا ہنس رہی تھیں لیکن اس کے پاس جو تصویریں تھیں، اس میں ان کے چہرے پر برائے نام مسکراہٹ تھی۔

"زندگی نے کیا ہنسنے کا خراج لیا تھا ان سے۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے جس میں وہ ہارون احمد کے ساتھ کھڑی ہنس رہی تھیں۔ اس نے غور سے تصویر کو دیکھا پھر اسے درمیان سے پھاڑ دیا یوں کہ وہ دونوں الگ ہو گئے۔

فریا نے اسلام آباد سے فون کیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔ تمہاری اکلوتی کزن کی شادی ہے اور تم ابھی تک وہیں پڑی ہوئی ہو، شرم کرو۔"

"کیا ابھی سے آجاؤں؟"

"ابھی سے، ہوش کرو۔ صرف اٹھائیس دن رہ گئے ہیں مجھے پرایا ہونے میں۔" وہ جھنجلائی۔

"اماں بی اور ابا میاں اکیلے ہو جائیں گے۔"

"زیادہ بہانے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں تمہارے ساتھ ہی آئیں گے، بس اب تیاری پکڑو۔ ایک دو روز میں روحیل بھائی چکر لگائیں گے وہاں۔"

"لیکن...."

"انکار نہیں سنوں گی۔" اس نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

تیسرے دن وہ روحیل بھائی کے ساتھ آ گئی تھی۔ اماں بی اور ابا میاں بھی ساتھ تھے۔ یہاں آ کر پتہ چلا تھا کردانیال کسی سیمینار میں شرکت کے لیے سنگاپور گیا ہوا ہے۔

سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ اس نے گہری نیند سوئی فریا کو دیکھا پھر دوپٹہ سر پر لیتی باہر آ گئی۔

"کون آ گیا اس وقت؟" اماں بی چپل گھسیٹتی کمرے سے نکل رہی تھیں۔

"آپ رہنے دیں اماں بی! میں دیکھ لیتی ہوں۔" سر پر رکھا دوپٹہ ایک مرتبہ پھر درست کیا۔

"آپ....!" اسے دیکھتے ہی کتنے رنگ بکھرے تھے اس کے چہرے پر۔

ذرا سا مسکرا کر اسے سلام کرتے ہوئے پورا گیٹ کھول دیا۔

"کیسی ہیں آپ مژگان؟" سلام کا جواب دے کر اس پر ایک نظر ڈالی۔

ہلکے آسمانی کڑھائی والے سوٹ میں نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ اس کو اپنی تھکن دور ہوتی محسوس ہوئی۔ کافی دن بعد دیکھا تھا، کافی بدلی بدلی لگ رہی تھی۔

"بالکل ٹھیک۔" بڑی طمانیت تھی اس کی آواز میں۔

"سب سو رہے ہیں۔" برآمدے کی سیڑھی پر بیگ رکھ کر اس نے پوچھا۔

"بس اماں بی جاگ رہی ہیں۔"

"ارے اماں بی بھی آگئی ہیں۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"ابا میاں بھی، اور کیا میں ان کو اکیلا چھوڑ کر آجاتی؟"

"ارے آپ تو بڑی ذمہ دار ہو گئی ہیں۔" ہلکے سے مسکرا کر اس نے چھیڑا۔

"آپ کچھ بھی نہیں بھولے۔" وہ خفت سے مسکرائی۔

"میں کچھ اچھی اچھی باتیں یاد رکھتا ہوں، کام آتی ہیں۔" زیر لب مسکراتے ہوئے آستین کے بٹن کھولتا وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ اچھی اچھی باتیں تو نہیں ہیں جو آپ نے یاد رکھیں۔" ناراضی سے گویا ہوئی تھی اس کے پیچھے چلتے ہوئے۔

"میں نے کچھ اچھی باتوں کے لیے ہی اس دن آپ کو فون کیا تھا جو آپ نے ابا میاں کو تھما دیا تھا۔" وہ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جی....!" یکدم ہی اسے اپنا چہرہ سرخ ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"اماں بی اپنے کمرے میں ہیں؟" اس کی کیفیت کو محسوس کر کے وہ ہلکا سا مسکرایا پھر پلٹ کر اندر کی طرف چل دیا۔

ردا بھابھی اماں بی کے پاس بیٹھی احمد کو دی جانے والی اشیا کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ وہیں تخت پر روحیل بھائی آنکھ بند کیے لیٹے تھے، شاید سو رہے تھے۔

"لیکن مما! مردوں کے لیے تو سونا حرام ہے۔" ردا بھابھی کی آواز روحیل بھائی کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ نہ صرف سوتے سے جاگ پڑے تھے بلکہ تڑپ اٹھے تھے۔

"آپ کسی دن کہہ دینا۔ مردوں کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، اور لیٹنا بھی حرام ہے۔" بہت بگڑ کر وہ بولے۔

"کیا ہو گیا، میں نے کب کچھ کہا ہے۔ کوئی خواب دیکھ لیا کیا؟" ردا بھابھی نے حیرانی سے ان کو دیکھا۔

"تم نے کہا نہیں تھا ابھی کہ مردوں کے لیے سونا حرام ہے۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"ہاں، وہ تو ہے ہی۔ کیا غلط کہا ہے؟"

"ہاں، سب چیزیں تم عورتوں پر حلال ہیں۔" وہ بڑبڑائے۔

"کھانا پینا، دن دن بھر لیٹے رہنا، آرام کرنا اور سونا۔"

"اوفوہ۔ سونا.... میرا مطلب تھا گولڈ۔ انگریزی والا گولڈ۔" وہ ہنسنے لگیں۔ "وہ تو حرام ہے نا مردوں پر۔"

"یوں کہو نا، بلاوجہ موڈ خراب کیا تم نے میرا۔"

* * *

فریا کی شادی سے تین روز قبل مایوں والے دن ہارون انکل اپنی فیملی سمیت آ گئے تھے، سب نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا تھا۔

وہ ابا میاں کے پاس کسی کام سے آیا تھا، تب ہی اس کے قدم اندر سے آتی آواز نے روک دیے۔

"ابا میاں! آپ اسے میری خواہش سمجھ لیں یا میری خوشی سمجھ لیں۔ مجھے لگے گا، میں نے کفارہ ادا کر دیا ہے اپنے اور اپنی بہن کے گناہوں کا۔" ہارون احمد ابا میاں سے کہہ رہے تھے اور ابا میاں بالکل چپ تھے۔

ابا میاں پچیس سال پہلے جو بدترین فیصلہ ہوا تھا، اس کی تلخی آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ میں آج بھی زونی کی روح کے آگے شرمندہ ہوں۔ کچھ میرے دل کو سکون ملے گا یہ سب کر کے۔ مژگان نیاور کے ساتھ خوش رہے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ابا میاں!"

وہ بڑے ملتجی لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"مجھے سوچنے دو ہارون میاں! مشورہ کرنے دو سب سے۔" ابا میاں کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیجیے ابا میاں! غور کر لیجیے مگر فیصلہ اگر میرے حق میں ہو گا تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"میں چاہتا ہوں ابا میاں! اس گھر کے دروازے پہلے کی طرح کھل جائیں۔ میرے قدم جو اب یہاں آتے ہوئے رُکتے ہیں' ان کی جھجک ختم ہو جائے۔"

"اپنے گھر آنے میں ہچکچاہٹ کیسی۔ اس گھر کے دروازے تو ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہے لیکن تم خود ہی۔۔۔" ابا میاں کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"نہیں ابا میاں!" وہ رکے۔

"کیا تم سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے ہارون؟"

"نہیں' میں تو آپ سے ایک اور مضبوط رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں ابا میاں!" ان کی آواز میں جو نمی تھی' وہ ابا میاں کا دل چیر گئی تھی۔

"کیا ابھی ہمارا رشتہ مضبوط نہیں ہے بیٹا؟"

"ایسی بات نہیں ہے ابا میاں! جو خوشی مجھ سے چھن گئی ہے' وہ مژگان کی شکل میں آپ مجھے پھر سے دے سکتے ہیں۔"

"ایک پھانس ہے جو مجھے چین لینے نہیں دیتی۔ وہ نفرت بھری نگاہ میں نہیں بھول پاتا' وہ جملہ مجھے آج بھی چبھتا ہے۔"

"مجھے آج اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے آپ سے محبت کی۔"

"یہ سب کر کے شاید میرے دل کو سکون مل جائے۔" انہوں نے دُکھے دل کے ساتھ سوچا مگر چپ رہے۔

"اور سمیعہ کا کیا کرو گے؟ کیا وہ زونی کی بیٹی کو تمہاری بہو کے روپ میں برداشت کرے گی؟" انہوں نے سوال اٹھایا۔

"نہیں اب میرا احساس کرنا ہو گا۔ بس آپ میری یہ خواہش پوری کر دیجیے۔"

وہ آہستگی سے پلٹ کر ابا میاں سے ملے بغیر سیڑھیاں اتر گیا۔

اس نے پرپل اور بلیو شیڈ کے آرگنزا کے نفیس دبکے کے کام والے سوٹ میں ملبوس مژگان احمد کو غور سے دیکھا۔

احمد سے ہنس ہنس کر رنگ کے لیے لڑتی' وہ پہلے سے کتنی مختلف لگ رہی تھی۔ سکون و اطمینان کے سارے رنگ چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ "کیا وہ اس کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے؟" وہ گہرا سانس لے کر اسٹیج سے اتر آیا۔

❊ ❊ ❊

ابا میاں ایک دم ہی بہت خاموش سے ہو گئے تھے۔ پچھلے دو دن سے وہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ ان کے پاس بیٹھنے آئی تھی کہ ذرا پوچھے تو سہی مسئلہ کیا ہے۔

"ابا میاں!" اس کے کوئی تیسری مرتبہ آواز دینے پر وہ چونکے۔ ان کے قریب تپائی پر رکھی چائے جانے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

"ہاں' کیا بیٹا؟" اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کیا سوچ رہے تھے ابا میاں؟" وہ ان کے پاس ہی کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"کچھ نہیں' میں کیا سوچوں گا بیٹا!" وہ ہنس دیے۔

"مجھے بتائیں نا ابا میاں! آپ آج کل کیا سوچتے رہتے ہیں آخر؟" اس نے اصرار کیا۔

"اب فریا تو اپنے گھر کی ہو گئی۔ اب تمہارے لیے ہی سوچتا رہتا ہوں۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یعنی یہ مسئلہ اتنا سنگین ہے ابا میاں کہ آپ کو کھانے پینے کا ہوش نہیں ہے۔" وہ چائے کے مگ کی طرف اشارہ کر کے ہنس دی۔

"چائے بنا دو اچھی سی میرے لیے' سر میں کچھ درد سا محسوس ہو رہا ہے۔" انہوں نے کنپٹیوں پر ہاتھ رکھے۔

"میں سر دبا دیتی ہوں نا ابا میاں!"

"چائے بنانے کو دل نہیں چاہ رہا کیا؟" وہ سر اٹھا کر پوچھنے لگے۔

"اچھا چلو' یہی دے دو۔ میں یہی پی لیتا ہوں۔"

"یہ میں نے کب کہا' ابھی لاتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی تھی' ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھا کر۔

"ہاں جاؤ' اچھی سی بنانا۔" پتا نہیں کیوں اسے لگا' وہ اسے ٹال رہے ہیں۔

"کیا کوئی بات ہے میرے متعلق جو آپ کو پریشان کر رہی ہے ابا میاں!"

"نہیں بیٹا!" اس کی بات پر وہ جلدی سے بولے۔

"پھر۔۔۔؟"

"رہنے دو بیٹا! تم چائے بنانے کے موڈ ہی میں نہیں ہو۔" وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے تھے۔ وہ گہرا سانس لے کر کچن کی طرف چل دی۔

نہ جانے کیا بات تھی جو انہیں پریشان کر رہی تھی۔

❊ ❊ ❊

پھر اماں بی کے بات کرنے سے قبل ہی ابا میاں نے انہیں ہارون احمد کی ساری بات بتائی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!" انہوں نے سناٹے میں آ کر انہیں دیکھا۔

"پھر کوئی غلط فیصلہ مت کیجیے گا۔ اب میرے اندر ہمت نہیں ہے۔" وہ ایکدم سے رو دیں۔

"میں نے ابھی ہاں نہیں کی ہے' اس سے سوچنے کا وقت لیا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"کیا آپ ہاں کر دیں گے؟" انہوں نے پوچھا۔

"شاید۔۔۔"

"آپ کو گھر میں دانیال نظر نہیں آیا اس کے لیے۔" شکوہ سا تھا ان کی آواز میں۔

"سب سے پہلا خیال اسی کے لیے تھا۔" وہ آہستگی سے کہہ رہے تھے۔

"پھر"

"شاید اس کو یہ سب پسند نہیں۔"

"دانی نے انکار کر دیا؟" ان کی آواز میں دکھ کے ساتھ ساتھ حیرت تھی۔ ہارون کے بات کرنے کے بعد میں نے نواز سے بات کی تھی دانی اور مژگان کی۔ وہ بہت خوش ہوا تھا لیکن شاید دانی۔ وہ رک گئے تھے۔

"آپ نے دانی سے بھی بات کی تھی۔"

"ہاں۔"

"پھر کیا کہا اس نے۔" وہ بڑی بے چینی سے پوچھ بیٹھی تھیں۔

اس نے کہا کہ اگر ہارون انکل ایسا چاہتے ہیں تو انہیں انکار مت کریں۔ وہ جو ساری زندگی آپ سے خفا رہے' شاید یوں مان جائیں۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"اس کی خفگی کے لیے میں اپنی بیٹی کو اپنے سے پھر جدا کر دوں۔" ان کی آواز پھر سے بھرا گئی۔

"یہ مت بھولیے کہ میں نے انجانے میں اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔" وہ آزردہ سے کہہ رہے تھے۔

"سب سے بڑی زیادتی تو آپ نے اپنی بیٹی کے ساتھ کی تھی۔" وہ سوچ کر رہ گئیں' بولیں کچھ نہیں۔

"میں نے سوچا تھا مژگان کے لیے دانیال ہے تو۔ میں اس کے مستقبل کی طرف سے بہت مطمئن تھا۔ میرا خیال تھا وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے مگر دانی ہی یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ اس نے صاف صاف کہا تھا کہ وہ ہارون انکل کے بیٹے کے لیے غور کر لیں' وہ ابھی اس قسم کا کوئی سلسلہ نہیں چاہتا۔" انہوں نے کھل کر پوری بات بتائی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ دانی نے انکار کر دیا ہے مژگان کے لیے۔" اماں بی کی بھرائی ہوئی آواز مژگان کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ اماں بی کے کمرے میں آتے آتے رک گئی تھی۔ ابھی ابھی تو مامی نے اسے کسی کام سے ان کے پاس بھیجا تھا۔

"اب آپ ہی بتائیے' میں کس برتے پر ہارون کو انکار کر دوں۔" وہ افسردگی سے کہہ رہے تھے۔

"ہاں پھر انکار کیوں کیا جائے؟" اماں بی کی آواز بھاری تھی۔

وہ آہستگی سے کمرے میں جانے کے بجائے گھر کے

پچھلے حصے کی طرف چلی آئی۔ جہاں پر مامی نے کچھ سبزیاں اگا رکھی تھیں۔

"تو آپ نے انکار کردیا۔" اس نے دکھے دل کے ساتھ حیرت سے سوچا۔

اس نے تو کبھی بھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا پھر اسے اتنی تکلیف کیوں ہوئی تھی دانیال احمد کا انکار سن کر۔

"تو تمہارے مستقبل کا فیصلہ بھی ہوگیا مژگان احمد۔" اس نے سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"ابا میاں سے بات کرنی ہوتی تو ان کے پرسنل سیل پر نہ کرلیتا۔" جھنجلاتی ہوئی آواز۔ بے اختیار ہی اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

"یہ سب کیا تھا۔" اس نے گھٹنوں پر سر رکھا۔

"میں نے کچھ اچھی اچھی باتوں کے لیے ہی اس دن آپ کو فون کیا تھا جو آپ نے ابا میاں کو تھما دیا۔ سادہ سا شکوہ۔

"کون سی اچھی اچھی باتیں تھیں وہ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

شام میں اماں بی نے اس سے بات کی تھی اور اس نے سارے فیصلے ان پر چھوڑ دیے تھے۔

"مجھے ان کا ہر فیصلہ منظور ہے' اماں بی! ابا میاں سے کہہ دیجیے گا۔"

"جب دانیال احمد نہیں تو کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے سوچا۔

اس سے بات کرنے کے دوسرے دن ہی وہ دونوں واپس چلے گئے تھے۔ اسے ماموں نے روک لیا تھا۔ فریا کے جانے کے بعد اتنی خاموشی بھی تو ہوگئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی تھی۔ نبیل کے سمسٹر شروع تھے' وہ اس میں لگا ہوا تھا۔ اکثر گھر میں ہی نہیں ہوتا تھا۔ دانیال اسے بمشکل ہی گھر میں نظر آتا تھا پھر وہ خود بھی کم ہی آتی تھی اس کے سامنے۔ وہ پہلے بھی اتنا نہیں بولتی تھی' اب تو اور بھی خاموش ہوگئی تھی۔

"مما! دو کپ چائے بھجوا دیں میرے کمرے میں۔" دانیال کی آواز آئی پھر اس نے کچن میں جھانکا۔ وہ نبیل کے پاس کھڑی سلاد کے لیے کھیرے کاٹ رہی تھی۔

"مما کہاں ہیں؟" وہ جانے کو پلٹا پھر کچھ سوچ کر اندر آگیا۔

"اپنے کمرے میں ہوں گی۔" اسے خود پتا نہیں تھا' وہ بہت دیر سے کچن ہی میں تھی۔

"اچھا....!" اس نے چائے کی کیتلی اٹھائی۔

"آپ جائیں' میں بنادوں گی چائے۔"

"نہیں' میں بنالوں گا۔ دو منٹ لگیں گے۔"

"ماموں کے لیے بنا رہی تھی میں۔"

"شکریہ.... دو کپ بنا دیجیے گا۔" اس نے زیادہ بحث نہیں کی تھی۔

"ظہور سے بھجوایئے گا میرے کمرے میں۔" سنجیدگی سے کہتا کچن سے نکل گیا۔

"صاف صاف نہیں کہہ سکے کہ میرے کمرے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

"میرے تو مستقبل کا فیصلہ ہو بھی گیا' اب آپ کیوں پریشان ہیں۔" اب نہیں پڑوں گی آپ کے گلے۔"

☆ ☆ ☆

ہفتہ کی شام وہ جانے کے لیے تیار تھی۔

"اب مجھے لگے گا فریا نہیں ہے اس گھر میں۔" مامی نے اسے گلے لگایا۔

"اپنا خیال رکھنا بیٹا!" انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ اتنے سے دنوں میں کیسی عزیز ہوگئی تھی وہ۔

"کاش دانیال انکار نہ کرتا۔" انہوں نے دل مسوس کے سوچا۔

"آپ کب آئیں گی وہاں؟" اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"اب تو جلدی جلدی آیا کریں گی۔" نبیل نے کہا۔

"ہاں' پہلے تو میں جیسے جاتی ہی نہیں تھی۔" وہ خفا سی ہوکر بولیں۔

"فریا کی خبر گیری کے لیے ابا میاں اور اماں بی ہیں تو پھر مجھے کاہے کی فکر ہے۔" نبیل کی بات سمجھ گئی تھیں وہ۔

"ہاں ہاں مما! پتا ہے مجھے۔" وہ زور و شور سے سر ہلانے لگا۔

"اچھا سسٹر! آتی رہنا۔ تم تھیں تو گھر میں رنگ و بو کا احساس ہوتا تھا۔ گھر آنے کو جی چاہتا تھا۔" نبیل نے گلے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"تو کیا اب تم گھر سے باہر رہا کرو گے؟" وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی

"نہیں بھئی! تمہارا دل رکھ رہا تھا تاکہ تم خوش ہوکر یہاں سے جاؤ۔" ہمارے عزائم تو خاصے بلند تھے تمہارے سلسلے میں بس....." وہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم ہی خاموش ہوگیا۔

"مما! ٹھیک کہہ رہی ہیں' اب لگے گا فریا چلی گئی۔" پھر وہ ہنس کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ سر جھٹک کر ماموں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ادھوری بات کا مفہوم اس کی سمجھ میں خوب آیا تھا۔

جب ماموں اسے خدا حافظ کہہ رہے تھے' تب وہ اس کے برابر میں آکر کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے منہ پھیر لیا اور وہ بھی کچھ خفا خفا سا پلٹ گیا۔ مژگان نے کچھ الجھ کر انہوں کی طرف دیکھا۔

"کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے بیٹی کہ اپنے ابا میاں اور اماں بی کا خیال رکھنا' وہ لوگ ہمیشہ ہی تنہا رہے ہیں۔" وہ آہستگی سے کہنے لگے۔ وہ سر ہلانے لگی۔

"جاؤ' فی امان اللہ۔"

انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے وہ دانیال کی طرف بڑھ گئی۔ ماموں انہیں دیکھنے لگے۔

"کتنے اچھے لگ رہے تھے دونوں ساتھ ساتھ۔" انہوں نے نظر ہٹالی۔ ایک دوسرے کے لیے بالکل۔

"کاش....!" انہوں نے بے بس ہو کر بے اختیار سی ایک نظر دانیال پر ڈالی جو اب اس کے ہاتھ سے بیگ لے رہا تھا۔

❋ ❋ ❋

یہاں آکر وہ خاصی مطمئن ہوگئی تھی اور اس نے ہارون انکل کو بھی ابھی تک یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں ابا میاں نے ان سے بات کی یا نہیں' اسے علم نہ ہوسکا۔ دن یونہی خاموشی سے گزر رہے تھے۔ فریا تقریباً" ہر دو دن چھوڑ کر چکر لگاتی تھی۔ اسی کے آنے سے گھر میں کچھ ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ کبھی کبھی افزاء آنٹی بھی آجاتی تھیں۔ ان ہی سے پتا چلا تھا سمیعہ آنٹی کی آج کل طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

اس نے انہیں نہیں دیکھا تھا اور اسے کوئی خاص شوق بھی نہیں تھا۔ فریا کی شادی پر بھی وہ نہیں آئی تھیں۔

"سوچ رہی ہوں' دیکھ آؤں کسی دن۔" اماں بی اس سے کہنے لگیں۔

"ٹھیک ہے' چلی جائیں۔" وہ ان کے دوپٹے میں مشین سے بیل لگا رہی تھی۔

"تم چلو گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں.....؟" اس نے حیران ہوکر انہیں دیکھا۔

"کیا حرج ہے؟"

"چلتی ہوں۔" وہ کسی بحث کے بغیر راضی ہوگئی۔

اس نے بنا کسی تاثر کے بستر پر لیٹی ہوئی اس عورت کو دیکھا۔ الجھے الجھے بال' جلی ہوئی رنگت' اندر کو دھنسی ہوئی پھٹی پھٹی سی آنکھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے۔ خشک ہونٹ جیسے مدت سے پیاسے ہوں۔ گہرے گہرے سانس لیتی یہ عورت' سمیعہ آنٹی تھیں۔

اس کے باپ کی پہلی بیوی جس کے حسد اور سازش نے اس کی ماں کو کہیں کا نہ رکھا تھا' اس کی سوکن بنا دیا تھا۔ کیسے انہوں نے اس کی ماں کا دل اجاڑ دیا تھا۔ سارے خون کے رشتوں کو ترسا دیا عمر بھر کے لیے اس عورت نے اور پھر اس کا اپنا کیا حال ہوا تھا۔

وہ اپنا گھر بھی نہ بچا پائی تھی۔ ایک حسد نے سب کے ساتھ ساتھ اس کا گھر بھی اجاڑ دیا تھا۔

"کیا اللہ نے اس کے باپ کے ذریعے انصاف کرایا تھا۔" اس نے حیرت سے سوچا۔

ورنہ وہ تو بڑے ٹھنڈے مزاج کے شخص تھے۔ شاید ان کے دو آنسوؤں سے ہی پگھل جاتے' انہیں معاف کر دیتے مگر اللہ تو سب سے بڑا منصف ہے۔ وہاں سے انصاف دلاتا ہے' جہاں سے امید نہیں ہوتی۔

وہ انہیں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔

"یہ زونی کی بیٹی ہے۔" ہارون انکل اس کا ہاتھ پکڑ کر ان کے نزدیک آگئے۔

"نہیں' نہیں۔ یہ زونی ہے۔" انہوں نے بے چینی سے تکیے پر سر پٹخا۔

"تم پھر آگئیں۔"

"تم نے میرا گھر اجاڑا تھا مگر سب کہتے ہیں' میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر جلا دیا تھا' اجاڑ دیا تھا۔ اجڑ تو میں اس دن گئی تھی جب تمہارے بھائی نے مجھے ٹھکرایا تھا پھر میں کیوں برداشت کرتی کہ تم میرے بھائی کے خواب دیکھو اور وہ پورے بھی ہو جائیں۔ میں نے تمہیں کتنی بددعائیں دی تھیں مگر سب کی سب جیسے مجھ ہی کو لگیں۔ تم بسی رہیں' میں اجڑ گئی ایسی کہ پھر نہ بس سکی۔ اب تم پھر آگئی ہو' اب کیا چھینو گی مجھ سے۔ اب کچھ نہیں ہے میرے پاس' میرے ہاتھ خالی ہیں۔ مجھے تم سے آج بھی نفرت ہے۔ جاؤ یہاں سے تم' ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔"

وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔ چیخ کر بولنے سے ان کے گلے کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہارون انکل اور آنٹی انہیں سنبھالنے لگے۔

"اماں بی۔۔۔ اماں بی۔۔۔!" وہ خوفزدہ سی ہو کر کمرے سے نکلی۔

"اماں بی! وہ مجھے مار دیں گی۔" وہ لاؤنج میں بیٹھی اماں بی کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا؟" خوف سے سفید پڑتا چہرہ اماں بی کو پریشان کر گیا۔

"پچیس سال سے تم یہاں ہو میرے پاس اس گھر میں۔ سب کہتے ہیں ابا میاں نے پچیس سال پہلے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ تم یہیں ہو' یہاں میرے کمرے میں۔ کبھی اس کرسی پر بیٹھتی ہو۔" اب وہ کھڑی ہو گئی تھیں۔

انہوں نے کرسی کو زور سے ٹھوکر لگائی۔

"کبھی میرے بستر پر لیٹ جاتی ہو۔" اب وہ کسی نامعلوم شے کو بستر سے دھکا دے رہی تھیں۔

"مجھے دیکھ کر ہنستی ہو اور میں پچیس سال سے رو رہی ہوں' کوئی مجھے چپ بھی نہیں کراتا۔"

وہ اب چیخ کر رو رہی تھیں۔ اماں بی بے چین ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ ابھی تو ان سے مل کر آئی تھیں تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک باتیں کر رہی تھیں۔

ان کی آواز صاف آ رہی تھی۔

"اماں بی! چلیں یہاں سے۔" اس کے ہاتھ پاؤں جیسے بے جان سے ہو رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی وقت باہر آ کر اس کا گلا دبوچ لیں گی۔

"ہاں' چلتی ہوں بچے۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں یہاں بالکل نہیں رکوں گی اماں بی!" انہیں سمیعہ آنٹی کے کمرے میں گھستا دیکھ کر وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔

"اماں بی! آپ نے مجھ سے اتنی محبت کی پھر یہ حسد یا دیوانگی کہاں سے آئی مجھ میں۔ کیوں کیا میں نے یہ سب کچھ؟" ان کا ہاتھ تھام کر وہ روتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"نارسائی کا کرب کبھی کبھی آدمی کو یونہی حاسد بنا دیتا ہے۔" اماں بی نے دکھی دل سے سوچا۔

"اب میں تجھے کیا بتاؤں' میں نے تو اپنے سب بچوں کی طرح ہی تجھے پالا تھا۔" ان کی حالت دیکھ کر وہ بھی رو دیں۔

"تجھے کیا خبر سمیعہ! کہ ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی

...نے ہمیں اپنی پسند بتا دی تھی۔ تجھے اس نے ...نہیں تھا۔" وہ دلگرفتہ سی کہہ رہی تھیں۔

...اسے کوئی اور پسند تھی۔ تیرے ابا اسے مجبور ...تھے' وہ کر بھی لیتا مگر کیا تو ایسے خوشی رہتی جیسے ...کے ساتھ رہی' جتنا عرصہ بھی سہی۔ اس نے ...ش تو رکھا تھا' پر تو نے خود ہی اپنا گھر اجاڑ دیا۔ ...ہم سب کو خون کے آنسو رلایا۔ تو کیا سمجھتی ہے' ...آنسو ہمیں دکھ نہیں دیتے' ہمیں نہیں ...۔ اس مرنے والی کو تو ایک بار ہی ہم رو چکے۔ ...بار بار مرتا ہوا دیکھیں' یہ بھی ہمیں بتا دے

...انہیں گلے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی

...اں بی! میں نے زونی کے ساتھ بہت برا کیا۔" ...لی بار انہوں نے یہ بات اعتراف کرتے ہوئے ...ی۔

...نے اپنے ساتھ بھی تو کچھ اچھا نہیں کیا بیٹی!"

...اں بی! مجھے معاف کر دیں۔" انہوں نے ان کے ...جوڑ دیے۔

...م سے معافی مت مانگ' خدا سے مانگ۔ ...وہ توبہ کر۔"

...ں زونی سے کیسے معافی مانگوں۔" وہ رو دیں۔

...بیٹی کا دکھ تو ساری زندگی رہے گا۔ تو دل سے ...ی تو زونی بھی تجھے معاف کر دے گی۔ جب ...ے دل کو سکون ملے تو سمجھ لینا' اس نے تجھے ...کر دیا ہے۔" انہوں نے دل بڑا کر کے ان کے ...دیے۔

..." وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

...اب گاڑی سے اتر کر بیل دینے کے ارادے ...کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اسے یوں افتاں و خیزاں ...پریشان ہو گیا۔

...۔ وہ مجھے مار دیں گی۔" اس کا ہاتھ مضبوطی ...ہاتھوں میں جکڑ کر وہ بڑی مشکل سے رندھی ...میں گویا ہوئی۔

"کون' کیا ہوا ہے؟" خوف سے سفید پڑتا چہرہ اسے بری طرح پریشان کر گیا۔

"چلیں۔۔۔ چلیں۔۔۔ پلیز یہاں سے۔" اس کا لہجہ ملتجی تھا۔

"اور اماں بی۔۔۔!" وہ پوچھنے لگا۔

"میں اب اندر نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا' آپ گاڑی میں بیٹھیں' میں انہیں لے کر آتا ہوں۔" اپنا ہاتھ چھڑا کر اس نے کچھ بھی پوچھے بغیر اسے گاڑی میں بٹھایا اور گیٹ کی طرف مڑ گیا۔

اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے شیشے چڑھا رہی تھی۔

"کیا آفت آگئی ہے اب؟" وہ سر جھٹک کر اندر داخل ہوا۔

سامنے ہی سے اماں بی آ رہی تھیں۔

"تم کب آئے؟" اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"آپ لوگوں کے گھر سے نکلتے ہی۔" اس نے بتایا۔

"ابا میاں نے لینے بھیجا ہے' اب کیسی ہیں آنٹی؟ ابا میاں بتا رہے تھے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں آج آ نہیں سکوں گی' تم مژگان کو ساتھ لے جاؤ۔"

"یہ مژگان کہاں گئی؟" انہیں ایکدم ہی بات کرتے کرتے اس کا دھیان آیا۔

"وہ گاڑی میں بیٹھی ہیں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"اس کا دھیان رکھنا۔ وہ ڈر گئی ہے سمیعہ کی باتوں سے۔ ہم سب تو جانتے ہی ہیں' وہ پہلی بار ملی تھی۔"

"میں آنٹی کو دیکھ لوں' میری ضرورت تو نہیں اماں بی!" وہ ان کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں بیٹا! اسے شاید کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ گہرا سانس لے کر اس کے پیچھے ہی چل دیں۔

گھر پہنچتے ہی وہ سیدھی ابا میاں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"ابا میاں! کیا بہت ضروری ہے کہ آپ ایک دفعہ پھر کوئی غلط فیصلہ کریں۔ کیا اس گھر کے سوا میں کہیں نہیں جا سکتی۔ آپ ایک بار پھر اپنی زونی کو کسی سمیعہ کے حوالے کردیں گے ابا میاں!" وہ رو رہی تھی ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔

"ابا میاں! کوئی بھی ہو، کہیں بھی مگر وہاں نہیں۔ میں مر جاؤں گی وہاں پر ابا میاں! ہارون انکل میرے باپ سے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ ان کے دل کے سکون کے لیے آپ میری قربانی کیوں دے رہے ہیں۔ میری مما بھی انہیں ضرور پسند کرتی ہوں گی لیکن جس گھڑی انہوں نے ان پر شک کیا ہوگا، مجھے یقین ہے اسی وقت انہیں ان سے نفرت ہوگئی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں نا میں بالکل مما جیسی ہوں تو پھر میرا یقین کرلیجیے، میں وہاں خوش نہیں رہ سکتی۔"

وہ روتے ہوئے کہے جارہی تھی اور وہ اسے ساکت بیٹھے دیکھے جارہے تھے۔

"خدا کے لیے ابا میاں! مجھے اس ماحول میں مت پھینکیے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ حسد، نا آسودہ خواہشوں کی قید میں نفرت سے سیاہ پڑتی عورت کو آج میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ حسد انسان کو کیسے کھا جاتا ہے، میں نے آج دیکھا ہے ابا میاں! ان کو دیکھ کر دکھ اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں ہوتا ابا میاں! مما کب کی مر گئیں لیکن ان کے لیے آج بھی زندہ ہیں اور ان سے اب بھی اتنی ہی نفرت کرتی ہیں۔ مجھے وہاں مت بھیجیں ابا میاں! میں بھی مر جاؤں گی۔ آپ کی زونی ایک دفعہ پھر مر جائے گی۔"

پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

ابا میاں بالکل خاموش تھے اور وہ خود دروازے ہی پر کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ ابا میاں کے لیے سوچوں کے نئے در کھول گئی تھی۔

کوئی ڈھائی تین بجے کے قریب جب ابا میاں تہجد پڑھنے اٹھے تھے، اس کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر انہوں نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اپنے بستر پر اسے بڑی بے ترتیبی سے پڑا دیکھ کر وہ فوراً ہی اند[ر] چلے آئے۔ اسے سیدھا کرتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ ر[کھا] تو وہ تپ رہا تھا۔

وہ فکر مندی سے دانیال کے کمرے کی طرف بڑ[ھے] مگر پھر ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ پہلے ہی کمرے [کے] دروازے پر کھڑا تھا۔

"خیریت تو ہے ابا میاں!"

"زونی! مژگان کو دیکھو۔ اس کی طبیعت ٹھیک [نہیں] ہے۔" ان کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر باقی کی پوری رات دونوں نے اس کے ماتھے [پر] برف کے پانی کی پٹیاں رکھ کر گزاری تھی۔

فجر کی اذان ہوئی تھی، تب اس کا بخار کافی کم ہوا [تھا] دواؤں کے زیر اثر اب سو رہی تھی۔

"ابا میاں! آپ اب سو جائیں، میں جاگ [رہا] ہوں۔" نماز پڑھ کر وہ ابا میاں کے پاس چلا آیا۔ ا[نہوں] نے وہیں کمرے میں نماز پڑھ لی تھی۔

"ہاں..... میں یہیں لیٹ جاتا ہوں....." وہ اماں بی کے بستر پر لیٹ گئے۔

بستر کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس [نے] بھی آنکھیں موند لی تھیں۔

اس کی آنکھ آٹھ بجے کے قریب کھلی تھی [تو] نظر کرسی پر بیٹھے ہوئے دانیال پر پڑی جس کی [آنکھیں] بند تھیں پھر اماں بی کے بستر پر لیٹے ابا میاں پر۔ پیاس لگ رہی تھی، اس نے اٹھنے کی کوشش [کی مگر] اٹھا نہ گیا۔

"ابا میاں!" اس نے ابا میاں کو آہستہ [سے آواز] دی۔ وہ تو نہ اٹھے، ہاں اس نے چونک کر آنکھیں [کھول] دیں۔

"کیا ہوا؟" وہ اٹھ کر اس کے بیڈ کے قریب [آیا۔]

"پانی چاہیے۔"

پانی لے کر وہ پلٹا تھا، وہ اٹھنے کی کوشش کر [رہی تھی۔] مدد دینے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا مگر [وہ اس کا] بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کر کے خود ہی اٹھ بیٹھی۔

اس نے خاموشی سے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا پھر پانی سے [بھرا گلاس] اس کی طرف بڑھا دیا۔ پانی پی کر وہ دوبارہ لیٹ [گئی۔]

[اس] کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ٹمپریچر چیک کیا پھر اس [کی] طرف ہاتھ بڑھایا۔

"[ا]تر گیا ہے بخار!" اس نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ [...] اندر کرلیا۔

"[مج]ھے کیا ہوا تھا؟" وہ مدھم لہجے میں پوچھنے لگی۔

"[یہ] بھی آپ ہی کو پتا ہوگا۔" وہ خشک لہجے میں کہتے [ہوئے کمرے] سے نکل گیا۔

[اب]ا میاں نے جاتے ہوئے دانیال کو دیکھا پھر [آنکھی]ں بند کرلیں۔

☼ ☼ ☼

[...] انہیں سب سے پہلے ہارون احمد سے معذرت [...]

[...] کو اماں بی واپس آگئی تھیں اور اس کے بخار کا [سن کر] ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"[آپ] نے مجھے بتایا ہی نہیں، ورنہ جب یہ صبح گیا تھا [...] دیکھنے، میں اسی وقت واپس آجاتی اس کے [...]

"[معم]ولی بخار تھا، کوئی آفت نہیں آگئی تھی۔" وہ [...] کھڑا ہو گیا۔

"[ابا می]اں! صبح تک پٹیاں کیوں رکھی تھیں۔ خود [...] مجھے سلا کر، اس معمولی بخار میں۔" ابا [میاں] سادگی سے اس سے پوچھنے لگے۔

"[آپ] نے بھی تو رکھی تھیں۔" وہ ابا میاں کی آواز [...] محسوس کر کے جھنجلا گیا۔

"[...] تو نواسی ہے، میں تو خیال رکھوں گا ہی۔" وہ [مسک]رائے تھے۔

"[میں] نے ان کا خیال کرلیا تو کیا ہوا۔ میں اپنے [...] ہی خیال رکھتا ہوں۔"

"[...]" وہ کچھ ناراض ہو کر بولے۔

"[...] پتا نہیں مریض کون ہے۔" ہلکے سے بڑبڑائے تھے، مگر اس تک آواز بخوبی پہنچی تھی۔

"ابا میاں....." اس کی آواز میں احتجاج سا تھا۔

"بیٹھو، ذرا ادھر۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہیں بٹھا لیا تھا۔

❁ ❁ ❁

"سمیعہ نے بلایا ہے تمہیں، دانی وہیں جارہا ہے، تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔" اس کے بخار اترنے کے کوئی تیسرے دن اماں بی نے کہا۔

"اس دن تو میں اتفاقاً بچ گئی تھی کسی طرح، اب آج بھی مجھے وہاں بھیج رہی ہیں۔ ابھی تو میرے بخار کی کمزوری ہی نہیں گئی ہے، میں کیسے....." ان کا پیغام سن کر ڈر سی گئی تھی۔

"چلی جاؤ، کچھ نہیں ہوگا۔" وہ ہلکا سا بیزار ہوئیں۔

"نہیں نہیں جارہی اماں بی!" اس نے صاف صاف منع کر دیا تھا۔

"ارے کچھ نہیں کہیں گی، پھر تمہارے ابا میاں بھی تو ساتھ جارہے ہیں۔" انہوں نے اب کے اسے پچکارا۔

"آپ نے دیکھا نہیں اس دن تو وہ ہارون انکل کے قابو میں ہی نہیں آرہی تھیں۔ اپنے ابا میاں تو پھر....." بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"سن رہی ہے کہ نہیں۔" اس کی نگاہوں کی التجا کو نظر انداز کر کے اپنے مخصوص انداز میں ڈانٹا۔

وہ چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔

"مجھے کچھ ہوا نا تو دیکھ لیجیے گا۔" دروازے پر پہنچ کر وہ ان کی طرف مڑی۔

"دیکھ لیں گے۔" انہوں نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"روک لیں مجھے، کہیں آپ کو پھر سے پچھتانا نہ پڑے۔" اس نے ایک کوشش پھر کی تھی۔

"جتنا پچھتانا تھا، پچھتا چکے بی بی! اب تم چلو۔" ان کی بے نیازی قابلِ دید تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دیکھ لیں پھر مجھے اچھی طرح' پتا نہیں واپس آؤں کے نہیں۔"

"اب تو ساری عمر ہی دیکھنا ہے' اب جاؤ بھی۔" وہ مایوس ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

سامنے ہی ابا میاں جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ دانیال ساتھ تھا۔

"چلیں بیٹا!"

"چلیں۔" در و دیوار کو بھرپور نگاہوں سے دیکھ کر اس نے قدم ان کے پیچھے بڑھا دیے۔

ان کے گھر میں گھستے ہی ابا میاں اسے ان کے کمرے کی طرف روانہ کر کے' خود ہارون انکل اور آنٹی کے پاس جا بیٹھے۔

جی کڑا کر کے وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی اپنے بستر پر وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سائیڈ پر رکھی کرسی پر دانیال بیٹھا نظر آیا تو کافی تسلی ہوئی۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر انہیں سلام کیا تھا۔

"ادھر آؤ میرے پاس۔" ان کا بہت نرم سا لہجہ تھا۔

بجائے ان کے پاس جانے کے وہ دانیال کی کرسی تھام کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کو آنٹی بلا رہی ہیں اپنے پاس۔" دانیال اس سے کہہ رہا تھا۔

وہ وہیں جم کر کھڑی رہی۔

"ڈر گئی ہے مجھ سے' میں نے بھی تو نہ جانے کیا کیا کہہ دیا تھا' ہوش ہی میں نہ تھی۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کارپٹ پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی۔

"چلی جائیں' وہ کتنی شرمندہ ہو رہی ہیں۔" دانیال نے اسے اب کے ذرا تنبیہی نظروں سے دیکھا تھا۔

ان کے علاوہ کمرے کی ہر چیز کا اس نے خصوصاً کھلے دروازے کا بغور جائزہ لیا۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی!" ان کی آواز پر وہ بے ساختہ ہی اچھل پڑی تھی۔ وہ نہ جانے کب بستر سے اتر کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بے ساختہ ہی کرسی پر بیٹھے دانیال کا بازو پکڑا تھا۔

"نہیں' کوئی بات نہیں۔" اس کا حلق خشک تھا۔ لگ رہا تھا ابھی جھپٹ کر اس کا گلا دبوچ لیں گی۔

"بیٹی! دیکھو تو میری طرف۔"

"میں وہیں دیکھ رہی ہوں۔" اس کے بازو کے ہاتھوں کی گرفت بڑھ گئی۔

"میں جانتی ہوں' تم مجھ سے بہت خوف زدہ" وہ کہنے لگی۔

"نہیں تو' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" کہتے ہوئے نظر اٹھ ہی گئی تھی۔

"ارے..... ہائیں....."

کتنی محبت بھری نگاہیں تھیں۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔

حسد اور نفرت انسان کے اعمال کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی بگاڑ دیتے ہیں تو وہیں محبت اور چہرے کو کس قدر خوبصورت بناتی ہے۔

اس کے دل سے ان کا خوف آہستہ آہستہ نکلنے لگا۔

"اللہ نے تو خود ان کے لیے سزا منتخب کی تھی" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اپنی ماں کی گناہگار کو معاف نہیں کرو گی؟" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی مگر گلے لگنے کی ہمت نہ کر سکی۔

"اب خدا کے لیے میرا ناتواں کندھا چھوڑ دیں" دانیال کی مسکراتی آواز پر اس نے ذرا سا جھینپ کر ہاتھ ہٹا لیا۔

❄ ❄ ❄

"آپ سیدھے سیدھے میرا نام نہیں لے سکتیں۔ یہاں نہیں' وہاں نہیں' کہیں بھی۔" وہ اس کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ اس کی بات پر اچھل پڑی۔ وہ تو بڑے سکون سے ہری بھری بیل کے پاس حسب معمول کرسی ڈالے کسی کتاب میں مگن تھی۔

"میں نے تو ابا میاں سے کچھ نہیں کہا۔"

"ابا میاں نے مجھ سے پوچھا تھا' میں نے تو سب کچھ کہہ دیا تھا ان سے۔ وہ آرام سے اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا کہا تھا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر وہ یہاں وہاں نہیں جانا چاہ رہیں تو مجھ سے کر دیں پھر۔" اس کا لہجہ سادہ سا تھا۔

"مجھے پتا ہے آپ کو یہ سب نہیں پسند۔" وہ آزردہ سی ہو گئی۔

"کیا مطلب؟"

"میں جانتی ہوں صرف ابا میاں کے کہنے پر آپ نے ہامی بھری ہے۔" اس کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔

"آپ خود ہی سب کچھ کیوں فرض کر لیتی ہیں۔" وہ بگڑا۔

"کیا پہلے مجھے آپ سے کوئی لمبا چوڑا عشق کرنا چاہیے تھا۔"

"تو اس وقت کیوں منع کیا تھا۔" اس کے جملے پر معترض ہوتے ہوئے وہ بھی بگڑ اٹھی تھی۔

"کس وقت؟"

"جب ابا میاں نے پوچھا تھا۔"

"میں سمجھ رہا تھا ابا میاں' ہارون انکل کو ہاں کرنا چاہتے ہیں اور میں خوامخواہ بیچ میں آ گیا ہوں۔" سادگی سے بتایا اور وہ محض گھور کر رہ گئی۔

"ویسے داد دیتا ہوں آپ کی ہمت کی' کیسے صاف صاف منع کیا تھا ابا میاں کو۔" وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

"میں ان سے ڈر گئی تھی۔" اس کے منہ سے بے اختیار ہی نکلا۔

"سمیعہ آنٹی سے؟" اس نے پوچھا۔

"اب تو ان کا ڈر نکل گیا ہو گا۔"

"نہیں' بیٹھ گیا ہے اندر۔" چڑ کر کہا۔

"اچھا۔" اس کی بات پر قہقہہ اڈ آیا۔

"ابا میاں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم سے ہی کیوں کروں' تب میں نے ان سے کہا تھا ان کی وجہ سے راتوں کو جاگنے کی پریکٹس ہو گئی ہے مجھے۔ اگر آدھی رات کو بھی فون کھڑکاتی ہیں تو میں ماتھے پر بل ڈالے بغیر ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ ہر مشکل میں اتفاق سے میں ہی نظر آتا ہوں انہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اس کی نظریں جھکتی چلی گئیں۔

وہ اپنے رب کا شکر کس طرح ادا کرے۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دانیال کو دیکھتے ہوئے عشق پیچاں کے سرخ' سفید اور گلابی پھولوں پر نظر جما دی۔

آج اس کی ماں کے اتنے سالوں سے بہائے آنسو اس کی راہوں میں جیسے سچے موتی بن کر چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

"اور یہ کہ ان کے آنسو اکثر میں نے ہی صاف کیے ہیں۔" وہ اس کے آنسوؤں کو پوروں پر چنتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

❄

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کھانا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف =/250 روپے

ملنے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار' کراچی